تاہم آیندہ لکھنے والون کیلئے انھون نے داغ بیل ڈالدی ہو، اور آیندہ اس عمارت کو اور زیادہ وسیع پیمانے پر تعمیر کیا جاسکتا ہے،

ثبوت ذکر جہر باحادیث وخبر مؤلفہ مولنا مشتاق احمد صاحب حنفی انبہٹوی، حجم ۲۰ صفحے، قیمت درج نہین، مجلس اشاعت العلوم،

اس رسالہ مین تصوف کے اصطلاحی حقیقی یعنی باآواز بلند ذکر کرنے کے جواز کو ثابت کیا گیا ہے، ثبوت مین اولاً صحیحین کی وہ حدیث پیش کیگئی ہے جسمین اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو بندہ مجھے دل مین یاد کرتا ہے، مین اس کو دل مین یاد کرتا ہون اور جو مجھے مجمع مین یاد کرتا ہے مین اس کو اس سے بہتر مجمع مین یاد کرتا ہون" اور دوسری حدیث ترمذی و مسند ابن حنبل کی ہے جسمین حلقہائے ذکر کو جنت کے باغون سے تشبیہ دیگئی ہے، لیکن معلوم نہین ان احادیث سے تصوف کے اصطلاحی ذکر کو مراد لینا کہانتک صحیح ہوسکتا ہے، مؤلف نے آخر مین تصریح کی ہو، کہ اگر یہ ذکر ریا سے ہو تو باآواز بلند ذکر کرنا اچھا نہین،

القول الاظہر فیما یتعلق بالاذان عند المنبر، مؤلفہ مولنا معین الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر، حجم ۴۶ صفحے، قیمت درج نہین، مجلس اشاعۃ العلوم،

مولنا احمد رضا خانصاحب بریلوی نے اپنے کسی رسالہ مین نماز جمعہ مین خطبہ کی اذان کو منبر کے پاس دینے کو غیر مسنون اور ناجائز ثابت کیا تھا، مولنا معین الدین صاحب نے زیر تبصرہ رسالہ مین اسی رسالہ کی تردید کی، اور عہد قدیم سے دور حاضر تک منبر کے سامنے کھڑے ہوکر اذان دینے کا جو طریقہ جاری ہے، اس کے استحسان کا نہ صرف تعامل و اجماع سے بلکہ کتب احادیث، و آثار و فتاوائے فقہیہ سے ثبوت فراہم کیا ہے، اور اپنے مقصد مین کامیاب ہوئے ہین،

سخاوت الشرافت فی کشف اسرار الجہر والمخافتہ:- از مولنا محمد سلامت اللہ صاحب حجم ۲۳ صفحے، قیمت ۱؍، مجلس اشاعۃ العلوم،

اس رسالہ مین نماز پنجگانہ مین سے تین نمازون مین باآواز بلند قرات کرنے اور دو نمازون مین آہستہ قرات کرنے کو بدلائل ثابت کیا گیا ہے، اور پھر اس جہر و سر کے رموز و اسرار کتب تصوف سے بتفصیل بیان کئے گئے ہین، رسالہ کی زبان قدیم وضع کی ہے۔

"ر"

جلد ۳۱ | ماہ شعبان المعظم ۱۳۵۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۲ء | عدد ۶

مضامین

تاہم آیندہ لکھنے والون کیلئے انھون نے داغ بیل ڈالدی ہو، اور آیندہ اس عمارت کو اور زیادہ وسیع پیمانے پر تعمیر کیا جاسکتا ہے،

ثبوت ذکر جہر باحادیث و خبر مؤلفہ مولٰنا مشتاق احمد صاحب حنفی انبہٹوی، حجم ۲۰ صفحے، قیمت درج نہین، مجلس اشاعت العلوم،

اس رسالہ مین تصوف کے اصطلاحی حقیقی، بآواز بلند ذکر کرنے کے جواز کو ثابت کیا گیا ہے، ثبوت مین اولاً صحیحین کی وہ حدیث پیش کیگئی ہے جسمین اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو بندہ مجھے دل مین یاد کرتا ہے، مین اس کو دل مین یاد کرتا ہون، اور جو مجمع مین یاد کرتا ہے مین اس کو اس سے بہتر مجمع مین یاد کرتا ہون" اور دوسری حدیث ترمذی و مسند ابن حنبل کی ہو جسمین حلقہائے ذکر کو جنت کے باغون سے تشبیہ دیگئی ہے، لیکن معلوم نہین ان احادیث سے تصوف کے اصطلاحی ذکر کو مراد لینا کہانتک صحیح ہوسکتا ہے، مؤلف نے آخر مین تصریح کی ہو، کہ اگر یہ ذکر ریا سے ہو تو بآواز بلند ذکر کرنا اچھا نہین،

القول الاظہر فیما یتعلق بالاذان عند المنبر، مرتبہ مولٰنا معین الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر، حجم ۴۶ صفحے، قیمت درج نہین، مجلس اشاعۃ العلوم،

مولٰنا احمد رضا خانصاحب بریلوی نے اپنے کسی رسالہ مین نماز جمعہ مین خطبہ کی اذان کو منبر کے پاس دینے کو غیر مسنون اور ناجائز ثابت کیا تھا، مولٰنا معین الدین صاحب نے زیر تبصرہ رسالہ مین اسی رسالہ کی تردید کی، اور عہد قدیم سے دور حاضر تک منبر کے سامنے کھڑے ہوکر اذان دینے کا جو طریقہ جاری ہے، اس کے استحسان کا نہ صرف تعامل و اجماع سے بلکہ کتب احادیث، و آثار و فتاوائے فقہیہ سے ثبوت فراہم کیا ہے، اور اپنے مقصد مین کامیاب ہوئے ہین،

سخاوت الشرافت فی کشف اسرار الجہر والمخافتہ - از مولٰنا محمد سلامت اللہ صاحب حجم ۲۵ صفحے، قیمت ۱؎، مجلس اشاعۃ العلوم،

اس رسالہ مین نماز پنجگانہ مین سے تین نمازون مین بآواز بلند قرأت کرنے اور دو نمازون مین آہستہ قرأت کرنے کو بدلائل ثابت کیا گیا ہے، اور پھر اس جہر و سر کے رموز و اسرار کتب تصوف سے بہ تفصیل بیان کئے گئے ہین، رسالہ کی زبان قدیم وضع کی ہے،

"ر"

جلد ۳۰ ام	ماہ شعبان المعظم ۱۳۵۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۲ء	عدد ۶

مضامین،

شذرات

اسپین کی نئی جمہوریت اسلام اور مسلمانون کے ساتھ اپنے جابر بادشاہون کی تاریخی غلطیون کی تلافی پر آمادہ نظر آتی ہے، ایک اسلامی علمی مجلس، اور ایک اسلامی علوم و فنون کی درسگاہ کی تحریک و تجویز آگے بڑھ رہی ہے، اسی طرح مشہور جامع مسجد کو جو مدت سے کلیسا کی شکل مین ہے، مسلمانون کو واپس کرنے کا خیال بھی آیا کرتا ہے، مگر ابھی فرانس اور کیتھولک پادریون کی مخالفت کامیابی کی راہ مین حائل ہے تاہم امید یہی ہے کہ مخالفتون کا بادل آہستہ آہستہ چھٹتا جائے، اور قرطبہ اور غرناطہ مین مسلمانون کی نوآبادیان قائم ہو سکین،

یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ دوسرے اسلامی ملکون مین بھی مذہبی اصلاح و خدمت کا جذبہ ترقی کر رہا ہے، اور اسلام کی عالمگیر برادری کا ٹوٹا ہوا رشتہ تخیل پھر جوڑا جا رہا ہے، مصر مین المنار کے بعد الفتح اس تحریک کا علمبردار ہے، شام مین الرشد اور عراق مین الصراط المستقیم ان خیالات کے پھیلانے مین کوشش کر رہے ہین، ساتھ ہی نوجوان مسلمانون کی انجمن کا جال بھی ہر جگہ پھیل رہا ہے، اور یہ مسلمان نوجوانون کی اخلاقی و دینی اصلاح کا بڑا ذریعہ ثابت ہو رہی ہے،

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان کی اسلامی سیاست تیزی سے اصلاح پذیر ہوتی جاتی ہے، اور عام طور سے ہندو مسلمان ان مشکلات کے حل کرنے مین کوشان ہین، گو ابھی دونون فرقون مین کچھ ایسے [illegible] کتے ہین

ہین جو ہنوز ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا نہین چاہتے، لیکن امید یہی ہے کہ جیسے جیسے اخلاص اور نیک نیتی کا اظہار طرفین سے ہوتا جائیگا بدگمانیان دور ہوتی جائنگی، اور اختلافات مٹتے جائین گے، اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر صوبہ کی اکثریت اپنے ذاتی حرص و طمع اور اپنے ہی لئے تمام فوائد و منافع کی ٹھیکہ داری کے تخیل سے ہاتھ اٹھائے، اور دوسرے فریق کے مناسب جائز توقعات کے ساتھ ہمدردی کا ثبوت پیش کرے، اگر اس کی چند مثالین بھی عملاً پیش ہوتی رہین، تو ساری بدگمانیان کائی کی طرح چھٹ جائین،

ہم نے پچھلے پرچہ مین "بزم تاریخ ہند" کی جو تجویز پیش کی تھی، اُس کے سلسلہ مین سیادت علی خان صاحب دگورنمنٹ کالج جھنگ) نے دو اور نام پیش کئے ہین، علامہ عبد اللہ یوسف علی، اور ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ایم اے، عبد اللہ یوسف علی یقیناً اس قابل ہین کہ وہ اس معاملہ مین ہماری رہبری کرین، اور شیخ عنایت اللہ صاحب تو ہماری مجلس کے پہلے ہی سے رفیق اعزازی ہین، اور اب بھی اُن کو اس خدمت سے عذر نہ ہوگا،

مگر ہم کو رہ رہ کر جو بات کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ انجمنون اور جمہوری ادارون کے ذریعہ کام انجام دینے کا سلیقہ ہم کو اب تک نہین آیا ہے، اس راستہ پر چلنے مین ہمیشہ تمہیدون اور طریقون کے خارزارون مین پھنسکر ہم رہ جاتے ہین، اور منزل مقصود تک نہین پہنچتے، خدا کرے کہ اس علمی سفر مین ہم کو اس مشکل سے سامنا نہ پڑے،
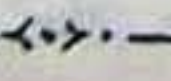
افسوس ہے کہ ہمارے بعض ہندو دوستون کو ہماری گذشتہ تحریر "بزم تاریخ ہند" کے بعض اشارون سے یا فقرون سے بدگمانی پیدا ہوئی ہے، ہمارا منشا یہ نہین ہے کہ ہم ہندوستان کی ایسی تاریخ لکھین جسمین یہان کے مسلمان بادشاہون کو سراپا معصوم اور بے گناہ ثابت کرین، بلکہ یہ مقصود ہے کہ ایسی تاریخ لکھین اور ایسے

طرز مین لکھین جس سے ہندو مسلمان دونون قومون مین منافرت پیدا ہونے کے بجائے یکجہتی اور اتحاد پیدا ہو، تاریخ کچا مواد ہے، اُس سے بنانے والا جو چاہے بنا سکتا ہے، چنانچہ انگریزون کے بعد جب سے ہندو مورخون نے کتابین لکھنی شروع کی ہین انھون نے ہندو دور کو جس آب و رنگ سے لکھنا شروع کیا ہے، اُس کو پڑھکر ہر ہندو طالب العلم مین اپنے بزرگون کی اچھی تقلید کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، ساتھ ہی چھوت چھات اور بودھ، جینی ویدک اور آریہ دھرم کے درمیان اتحاد کا خیال بڑھتا ہے، اور اس مین متحدہ ہندو قومی اسپرٹ پیدا کیجاتی ہے کیا اتنی اصلاحون کے بعد ہمارے ہندو مورخ اتنی اصلاح اور نہین کرسکتے کہ واقعات کو اس رنگ مین لکھین جس سے ہندو مسلم خلیج کا پاٹ بڑھنے کے بجائے گھٹتا جائے،

مثال کے طور پر ہم یہان ایک واقعہ لکھتے ہین، ڈاکٹر ایشوری پرشاد محمود غزنوی کے حملۂ ہند کے سلسلہ مین جہاد کا لفظ بولکر اس پر یہ حاشیہ لکھتے ہین :-

"اہل اسلام کا خیال تھا کہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کا فرون یعنی اسلام نہ ماننے والون سے لڑائی کرکے یا تو اُن کو دائرۂ اسلام مین شامل کرلے یا تلوار کے گھاٹ اُتار دے، اسی لڑائی کو جہاد کہتے ہین،" (ص ۱۳۵ اسٹوڈنٹس ہسٹری)

ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق بجائے خود کہان تک درست ہے، اس کو الگ رکھئے، جس وقت یہ کتاب اسکول کے کسی درجہ مین پڑھائی جاتی ہوگی، دونون فرقون کے جذبات پر اس تشریح جہاد کا کیا اثر پڑتا ہوگا؟ وہان مسلمان لڑکے یا تو شرم سے عرق عرق ہو جاتے ہونگے یا غصہ مین آکر کتاب اور مدرس کتاب سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہون گے، کیا اگر ہم اپنے ہندو مصنفون کو اس طریقۂ تالیف کی اصلاح کا مشورہ دیتے ہین، تو اُنکے ساتھ بدگمانی کرتے ہین،

مقالات

ہندوستان کی تاریخ

از

جناب پنڈت منوہر لال صاحب زتشی، لکھنؤ

ہم نے معارف کے گذشتہ پرچہ مین "بزم تاریخ ہند" کے عنوان سے جو کچھ لکھا تھا، اس کو پڑھکر سب سے پہلے ہمارے دوست پنڈت منوہر لال زتشی (سابق پرنسپل ٹرینگ کالج لکھنؤ) نے ہم کو حسب ذیل مراسلہ بھیجا ہے، پنڈت صاحب موصوف اردو زبان کے لائق ادیب، اور تاریخ اسلام سے واقف، اور مرنج مرنجان بزرگ ہین، امید ہے کہ موصوف کی یہ پہل ہمارے کام کے لئے فال نیک ثابت ہوگی۔"

"معارف"

فرشتہ یاد

نہین ہے جناب عالی۔ نومبر ۱۹۳۲ء کے معارف کے پرچے مین آپ نے مقالۂ "بزم تاریخ ہند" کے سلسلہ مین ایک نوٹ تحریر فرمایا ہے، اس مین آپ نے پہلے پروفیسر رمن کے خلاف ناراضی کا اظہار کیا ہے کہ انھون نے یورپ کے الزام کی ایک بازخم کہانی کو حضرت عمر کے خلاف کیون دہرایا، اسکے بعد دی لائف آف اے پرنسس کے اس بیان کی تردید ہے کہ جہان آرا ایک راجپوت پر عاشق تھی گو اس تردید کی تائید مین آپ نے کوئی دلیل سوا اس کے نہین پیش کی کہ جہان آرا صوفی تھی اور حضرت خواجہ چشت خواجۂ اجمیر کی معتقد حسن و عشق کی منزل ملت و مذہب سے بالاتر ہے، ممکن ہے کہ دی لائف آف اے پرنسس کا یہ بیان غلط ہو اور ممکن ہے کہ صحیح ہو، بہرحال صوفی ہونے سے نہ اسکی تردید ہوتی ہے نہ تائید، اس کے بعد تیسرے پیراگراف مین آپ نے ارشاد فرمایا ہے،

"پونہ کی تاریخ آفرین" مرہٹہ سوسائٹیون مین جو کچھ ہو رہا ہے اس کا رازدان ہمارے دوست سے بڑھکر پورے ہندوستان مین کوئی نہین، پونہ، بمبئی، بنگال اور الہ آباد کے مصنف پروفیسرون کی تاریخی تصنیفات مین جو کچھ لکھا جا تا ہے

وہ کسی سے پوشیدہ نہین، آجکل الہ آباد کے پروفیسر ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی تاریخ ہند ہمارے صوبہ مین پڑھائی جاتی

ہے اس کا صرف وہ باب پڑھنا کافی ہے جس مین عالمگیر اور سیواجی کی داستان لکھی گئی ہے"

جہان تک مین نے اس پیراگراف کو سمجھا ہے اس کا روے سخن ہندو مصنفین کی طرف ہے اور آپکی رائے یہ ہے کہ جو ہندو

آجکل پونہ، بمبئی، بنگال اور الہ آباد مین تاریخ ہند پر کتابین لکھ رہے ہین وہ جان بوجھ کر غلط بیانیان کر کے مسلمانون کو قابل اتہام

بناتے ہین، مین اس کے متعلق چند باتین عرض کرنی چاہتا ہون، کیا یہ ممکن نہین کہ ان لوگون کی نیت خراب نہ ہو اور جس اختلاف

کی بنا پر آپ ان سے ناراض ہین وہ واقعی اختلاف رائے ہو، کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ آگے چل کر تاریخ ہند کی تصنیف کے واسطے جن

بارہ اشخاص کی فہرست آپ نے پیش کی ہے ان مین واقعات تاریخی کے متعلق یا واقعات تاریخی سے گذر کر ان واقعات کے اسباب

و نتائج پر رائے زنی کرتے وقت کبھی اختلاف نہین ہوگا، مین مانتا ہون کہ عالمگیر مسلمان تھا اور سیواجی ہندو مگر کیا یہ ممکن نہین

کہ اس زمانہ کی تاریخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور جناب سید سلیمان ندوی دونون ٹھنڈے دل سے صداقت اور قابلیت کیساتھ پڑھین

مگر آخر مین مختلف نتائج پر پہنچین اور یہ اختلاف بے ایمانی اور بدنیتی سے بری ہو اور ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہون کیا یہ بالکل ناممکن

ہے کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد ہی کی رائے صحیح ہو اور جناب سید سلیمان ندوی کی رائے غلط ہو۔ آپ پروفیسر ... مین

کہ انھون نے حضرت عمر کے خلاف ایک ایسے امام کو درج کیا جسکو آپ غلط سمجھتے ہین انکو تو معلوم ہی ہوگا کہ حضرات شیعہ اسی فاتح قیصر و کسریٰ کے بارہ مین کیا

اسلام یا مدینہ ... سنی شیعہ کے اختلافات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور اس ہزار دو سو برس کی لڑائی کی بنا کیا ہو، ان واقعات کے متعلق اختلاف جو مدینہ

کے شہر مین پچیس تیس برس کے اندر پیش آئے، مین جانتا ہون کہ آپ سنی ہین مگر کیا آپ یہ کہنے کو تیار ہین کہ جتنے شیعہ مورخین

اور مصنفین نے اس زمانے کے واقعات کو آپ کے خیال اور آپ کی رائے کے خلاف بیان کیا ہے وہ سب بے ایمان تھے

اور انھون نے ہر موقع پر جان بوجھکر غلط بیانی کی ہے، مولنا شرر لکھنوی مورخ اور محقق سمجھے جاتے تھے، انکی ایک تصنیف

سکینہ بنت حسین پر جو شورش بعض اسلامی حلقون مین ہوئی تھی اس سے تو آپ واقف ہونگے، شمس العلما مولوی نذیر احمد

دہلوی کی ایک تصنیف ہے امہات الامۃ اس کے متعلق حیات النذیر مطبوعہ ۱۹۱۲ء کے صفحہ ۴۳۰ پر یہ عبارت درج ہے،

"بہرحال مصنف امہات الامۃ کیساتھ جو سلوک کیا گیا وہ یہ تھا اب امہات الامۃ کا حشر سنئے کہ اسکی کل جلدین دہلی کے بعض ممتاز مخصوص

کے کہنے سے ایک تاجر کو دیدی گئین اور ایک وقت معین کے بعد جلا کر خاک سیاہ کر دی گئین ... شمس العلما علامہ شبلی فرماتے تھے ...

علامہ موصوف یہ بھی فرماتے تھے کہ کتاب قابل سوختنی تھی ... !

اگر نذیر احمد اور شبلی مین ایسے اہم معاملہ مین اختلاف رائے ہو سکتا ہے تو ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور جناب سید سلیمان ندوی مین

کیون نہین ہو سکتا، ہان ایک ہی بات ہے اور وہ یہ کہ اول دونون حضرات مسلمان تھے اور آخری دونون حضرات مین ایک ہندو ہین، اور تو اور

علامہ شبلی کی مشہور تصنیف الفاروق کی نسبت شیعہ حضرات کی رائے آپ سے پوشیدہ نہ ہوگی اور آپکو یہ بھی معلوم ہوگا شعر العجم کی تنقید پنجاب کے بزرگون کیطرف

سے کس بری طرح کی گئی ہے،

اس ساری تحریر سے میرا مطلب صرف اسقدر ہے کہ جو کوشش ہندوون کیطرف سے ہندوستان کی تاریخ لکھنے کی ہو رہی ہے اسکو آپ نے

جسطرح یاد کیا ہے وہ آپ کے شایان شان نہین، اور جسطرح سب مرہٹہ سوسائٹیون اور پونہ، بمبئی، بنگال اور الہ آباد کے کل مصنف پروفیسرون

کو آپنے ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہے وہ بے تعصبی اور رواداری کے معیار سے فروتر ہے، ممکن ہے کہ پونہ کی مرہٹہ سوسائٹیون مین سے کسی نے کہین

غلطی کی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مصنف پروفیسر نے کہین غلط بیانی کی ہو مگر یہ کہان نہین ہوا اور کہان نہین ہوتا، انسان پھر انسان ہے

فرشتہ یا دیوتا نہین ہے، کیا یورپ کی تواریخ مین ایسے اختلافات نہین، کیا خالص اسلامی تاریخ ان سے قطعی بری ہے، اگر ایسا

نہین ہے تو ہندوون کے خلاف اس طعن و تشنیع کے کیا معنی؟ مین جانتا ہون کہ ہندوون کو برا بھلا کہہ کے واہ واہ حاصل کر لینا

آسان ہے، مگر مین اب تک معارف کے معیار کو اور جناب سید سلیمان ندوی کی ذات کو اس سے ارفع سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہون

مین ہندو ہون اور ہندو ہونے پر فخر کرتا ہون مگر مین نے جو کچھ لکھا ہے اس مین تعصب یا جانبداری کو دخل نہین

... ہو کر بھی مین نے اپنے خیال اور اپنے اصول کے مطابق ہندوون کے سوشل رسم و رواج اور مذہبی عقائد کی کمزوریون

کو ظاہر کرنے سے کبھی دریغ نہین کیا، مین ان ہندوون مین نہین جو اپنے گروہ اور اپنے بزرگون کے ہر قول و فعل کو صحیح

اور درست سمجھتے ہین، اور کھوٹے اور کھرے مین تمیز کرنے کو گناہ جانتے ہین،

معارف:۔ ہم نے پنڈت صاحب کے اس خط کو جو اپنے لب و لہجہ اور طعن و طنز کے لحاظ سے قابل شکایت ہے،

بجنسہ چھاپ دیا ہے، پنڈت صاحب نے اس مراسلہ مین تین باتین لکھی ہین، ایک نیک نیتی اور بدنیتی کا سوال، دوسرے رائے اور

نظریہ کا اختلاف، تیسرے اسباب ونتائج کے بیان کا اختلاف، ہمین یہ تینون باتین تسلیم ہین،

سب سے پہلی بات یہ عرض ہے کہ تاریخ کی تعلیم وتصنیف کی دو غرضین ہین، ایک تو حقائق کا اثبات، دوسرے عوام اور طالب علمون کو اپنے ملک و وطن اور اسمین بسنے والی قومون کے آپس کے تعلقات سے باخبر کرنا جس سے مستقبل مین قومون کے درمیان خوشگوار روابط اور تعلقات پیدا ہوسکین، اسکولون مین ہندوستان کی جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے، اسکا منشأ "اثبات الحقائق" کا اثبات نہین، جن کی نفی و اثبات اور اسباب ونتائج مین اہل تحقیق کے مختلف خیالات ہین، کہ طرفین کے دلائل کو رد و قدح کے بعد نقل کرنا اور فیصلہ دینا اسکول کی مختصر کتابون مین ممکن نہین، پھر ایسے واقعات کو لکھنا جن کے اسباب ونتائج مین مختلف قومون کے مختلف خیالات ہین، یا واقعات کو ایسے رنگ مین لکھنا جو کسی قوم کے نزدیک قابل اعتراض ہے اور پھر ایسی کتابون مین لکھنا جو ہر قوم کے بچون کے لیے لکھی گئی ہین کہان تک قابل پسند ہے،

اسکولون مین ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی تاریخ اس غرض سے نہین پڑھائی جاتی ہے کہ اس سے ایک مصنف یا مصنف کی قوم کے خیالات اور نظریئے معلوم ہون، اگر یہ کتاب اس غرض سے ایسے عام اسکولون مین پڑھائی جاتی ہے تو کیون نہ اسی کے ساتھ "جناب سید سلیمان صاحب" کی بھی کوئی تاریخ پڑھائی جائے، تاکہ اس سے اس مصنف یا اس مصنف کی قوم کے خیالات اور نظریئے معلوم ہون، مسلمان بادشاہون اور حکمرانون اور فاتحون کو برا بھلا کہکر واہ واہ حاصل کرلینا آسان ہے، مگر مین اب تک ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور دوسرے نیک نیت ہندو مصنفون اور پبلشرون کی ذات کو اس سے ارفع سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہون"

اس قسم کی کتابون کو محض اس بھروسہ پر لکھنا اور اسکولون کے نصاب مین داخل کرنا کہ لکھنے والے مصنف پڑھنے والے طالب العلم اور چھاپنے والے اصحاب مطابع، اور پبلشر اور کتابون کے چھننے والے ممبر زیادہ تر ہندو ہین، اور انکی واہ واہ اسی طرح حاصل ہوسکتی ہے، کچھ زیادہ منصفانہ اور دانشمندانہ کام نہین ہے،

اب رہ گیا حقائق کے اثبات کا مسئلہ تو اس کے لئے کالجون کا میدان کافی ہے، اور ضرورت ہے کہ ہر صاحب نظر اپنی اپنی تحقیق دلائل کے ساتھ پیش کرے، لیکن ضرورت ہے کہ اس مین نامستند تحریرون، جعلی دستاویزون، اور مصنوعی

واقعات پر بنیادین کھڑی نہ کیجائین، اس قسم کا کام بعض غرضمند انگریز مصنفون نے شروع کیا، اور بعض ہندو مصنف بلاتحقیق اسکی تقلید کر رہے ہین، جیساکہ ٹاڈ نے راجستھان مین اور ڈف نے تاریخ مرہٹہ مین کیا ہے، اور اسی طرح کا وہ طویل خط ہے جس کو کہا جاتا ہے کہ ایک راجہ نے عالمگیر کو بھیجا تھا،

علیٰ ہذا، ان یورپین سیاحون کے بیانات ہین، جو اکبر کے زمانہ سے ہندوستان مین آنے لگے تھے، اور جنمین سے بعض نے شاہی بیگمات کی نسبت نہایت لغو باتین لکھی ہین، ان باتون کو مشرقی آداب و رسوم سے ناواقف کا تو قبول کرسکتا ہے، مگر مشرقی طرز و آداب کو جاننے والے بے سند قبول نہین کرسکتے، مس میو نے ہندو یا ہندوستانی معصوم دیویون کی نسبت چند ماہ کے سفرِ ہند مین جو کچھ لکھ ڈالا اسکی نسبت صرف یہ کہدینا کہ انکی تردید مین کوئی دلیل نہین پیش کی گئی، فضول بات ہے،

ظاہر ہے کہ دعویٰ کو سند اور دلیل سے مضبوط کرکے پیش کرنا مدعی کا کام ہے، اسکی تردید مین اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ یہ واقعہ ثابت نہین، ورنہ ہر شریف سے شریف ہندو مسلمان تاریخی خواتین پر کوئی اخلاقی الزام آج ہر مصنف قائم کرسکتا ہے، اور جواب مین کہہ سکتا ہے کہ مجیب اسکی بدلائل تردید کرے،

"فاتح قیصر و کسریٰ" کی نسبت بے شبہہ حضرات شیعہ دوسری رائے رکھ سکتے ہین، لیکن ہر رائے کی تائید مین واقعات کا موجود ہونا ضروری نہیں، چنانچہ الفاروق پر تنقیدین بہت لکھی گئین، مگر دوسری رائے کے مطابق کوئی الفاروق لکھی نہ جاسکی،

کتبخانۂ اسکندریہ کے الزام کی کیفیت یہ ہے کہ مسلمانون کو چھوڑکر اب خود یورپ کے محققون نے اس کی تردید کردی ہے، اور کم ازکم آٹھ دس مضمون اس الزام کی تردید مین خود اردو مین نکل چکے ہین، اور پھر اب تک وہی سنی سنائی بات "غیر نہین" ہمارے بعض ہندو بھائی دہراتے ہین، تو کیا یہ تعجب انگیز نہین،

کسی مصنف کی کتاب مین اتفاقی غلطیون کا پایا جانا فطرت انسانی ہے، شعر العجم مین جو مشرقی تذکرون پر مبنی ہے، سنین اور نام و نسب کی غلطیان مغربی تحقیقات کے مطابق دکھائی گئی ہین، ان مین سے بعض صحیح بھی ہین اور

بعض غلط بھی، لیکن اگر شعر العجم کی تنقید پنجاب کے بزرگون کی طرف سے "بُری طرح" کی گئی، تو اس "بُری طرح" کو تو کسی نے اچھا نہین سمجھا،

مولانا عبد الحلیم صاحب شرر اور مولانا نذیر احمد صاحب نے جو کچھ لکھا، اس مین واقعات کا اتنا عیب نہ تھا، بلکہ طرز ادا اور طریقۂ تعبیر کی افسوسناک غلطیان تھین، بات یہ ہے، کہ یہ زیادہ تر افسانہ نویس تھے، افسانہ نویسی کا منجھا ہوا قلم، قابلِ ادب بزرگون کے حالات لکھنے مین بھی شوخ نگاری سے باز نہ آیا، اس کا نتیجہ مسلمانون کی عام برہمی کی صورت مین ظاہر ہوا، امہات الامہ کے بعض فقرے مجھکو اب تک یاد ہین، مثلاً عرض ہے، "فاطمہؓ اور عائشہؓ مین تو جوتیون مین دال بٹتی تھی" اس مفہوم کو اگر یون ادا کیا جاتا کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عائشہؓ مین باہم ملال خاطر تھا، یا ان دونون کے دل باہم صاف نہ تھے، یا ان دونون کے درمیان اختلاف تھا، تو چندان قابلِ اعتراض نہ تھا، لیکن مولوی صاحب مرحوم کی زبان پر یہ محاورہ ایسا چڑھ گیا تھا کہ ایک دفعہ مجھے اُن سے دلّی مین ملنے کا اتفاق ہوا تو شاید ایک نشست مین تین چار دفعہ وہ اس محاورہ کو بولے،

مین نے تمام ہندو مصنفون اور مورخون کی نسبت ہرگز یکسان رائے ظاہر نہین کی ہے، سر جدو ناتھ سرکار سے غلطیان ہوئی ہین، مگر ان کو بدنیت نہین کہا گیا ہے، اسی طرح ڈاکٹر بنی پرشاد مصنف جہانگیر کی نسبت سب نے اچھے خیال کا اظہار کیا، ڈاکٹر تاراچند مصنف مقالہ "عرب و ہند" کی سب نے تعریف کی ہے، جٹس راناڈے کے مضامین سب نے پسند کئے ہین،

سوءِ نیت اور حسنِ نیت کا اندرونی حال کون جانتا ہے، انسان تو ظاہر بین ہے، قرائن سے اندر کا حال دریافت کرتا ہے، وہ قلم جو قبل از اسلام ہند کی تاریخ مین سراپا امن اور شانتی اور اپنے لیے صرف حسنِ عمل کا انتخاب کرتا ہے، اور دوسرے قسم کے واقعات کو نظر انداز کر جاتا ہے، وہی دفعۃً اسلام کے عہد مین اگر اس درجہ انصاف پسند ہو جاتا ہے، کہ اچھے بُرے ہر قسم کے واقعہ کے ذکر کئے بغیر اس کی دیانت داری کا احساس مجروح ہو جاتا ہے، اور ہر معاملہ مین اس کو مسلمان حکمرانون کی صرف برائیان نظر آتی ہین، اور انھین کے پھیلانے مین اس کو لطف آتا ہے،

اور بھلائیون کو اتنا لپیٹ کر بیان کرے، کہ وہ واقعہ کا غیر ضروری پہلو ہو جائے، یہ کہان کا انصاف ہے؟

ابھی پٹنہ یونیورسٹی کی اردو تاریخ کے اقتباسات جریدۂ امارت پھلواری مین شایع ہو چکے ہین اغلاط تاریخی کو چھوڑ کر ایک ہی کتاب کی ایک ہی سطر مین اس درجہ غیریت برتی گئی ہے کہ ہندو راجاؤن کے لیے جمع کا صیغہ تعظیم اور مسلمان بادشاہون کے لیے تحقیر کا صیغۂ واحد شروع سے آخر تک استعمال کیا گیا ہے، کیا اس کو رائے اور نظریہ کا اختلاف کہا جائے،

معارف نے آج جس طرح ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی کتاب پر اعتراض کیا ہے، کل اُس نے اسی طرح مرحوم صلاح الدین خدا بخش اور ڈاکٹر شفاعت احمد خان کی تاریخون پر اعتراضات کئے تھے، مگر کیا آج کا کام ہمارے دوست کے نزدیک اس لیے قابلِ اعتراض ہے کہ وہ مسلمان تھے، اور یہ ہندو ہین،

پنڈت صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا قلم ہمیشہ ہندو مسلمانون کے مقابلہ مین بے تعصب رہا ہے، اور ہندوؤن کے علوم و فنون کی مدح مین کمی نہین کی ہے، با این ہمہ اگر مجھ جیسے مسلمان سے، پنڈت منوہر لال زتشی جیسے بے تعصب ہندو کو یہ بے اعتباری اور بدگمانی ہو تو

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

دیباچہ مثنوی تغلق نامہ

بقلم مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی رکن دار الترجمہ حیدرآباد دکن،

تغلق نامہ جو امیر خسرو کی نایاب مثنوی ہے، وہ مولوی سید ہاشمی صاحب کے دیباچہ کیساتھ مجلس مخطوطات فارسیہ کی طرف سے شائع کی جارہی ہے، چونکہ جناب سید صاحب کا یہ دیباچہ بجائے خود تاریخی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے وہ الگ بھی معارف مین شائع کیا جارہا ہے، سید صاحب کے ممنون ہین کہ وہ ناظرین معارف کو "مشاعرہ" سے پہلے اپنی "غزل" پڑھنے کی اجازت دیرہے ہین،

"معارف"

تغلق نامہ کی تاریخی نوعیت جیساکہ امیر خسرو کی سوانح تذکرون اور فارسی تاریخون سے ثابت ہے، اُن کی سب سے آخری تصنیف مثنوی تغلق نامہ ہے، جو انھون نے صاحبِ منتخب التواریخ کے بقول سلطان غیاث الدین تغلق اول کی فرمایش سے تحریر کی تھی، قران السعدین، دول رانی خضرخان، خزاین الفتوح اور نہ سپہر کی طرح یہ بھی اپنے عہد کی نہایت دلچسپ اور مفید تاریخی نظم ہے جس مین سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے قتل، خسروخان کی چند روزہ بادشاہی اور پھر غیاث الدین تغلق کی فتحمندی اور تخت نشینی کے حالات درج ہین، یہ تمام واقعات شاعر کی زندگی اور بعض اوقات اس کی موجودگی مین ہوئے تھے، اگر کشف الظنون اور مُلا عبدالقادر کا قول صحیح مانا جائے کہ یہ مثنوی ۷۲۵ھ ہجری مین نظم ہوئی تو ایک احتمال ہوتا ہے کہ شاید اس مین تغلق اول کے عہد بادشاہی کے حالات بھی ہونگے جو کتاب کے آخری اوراق ضائع ہونے کی وجہ سے اب مفقود ہوگئے، لیکن کشف الظنون اور بعض تذکرون مین یہ بھی لکھا ہے کہ

تعداد اشعار اس مثنوی کے کل اشعار کی تعداد تین ہزار تھی، اور جو نسخہ اب ہمیں دستیاب ہوا، اس مین حیاتی کاشی کے

اشعار وضع کردینے کے بعد بھی جو اشعار محفوظ ہین (مع منظوم عنوانات) اُن کی تعداد (۲۴۰۲) بچتی ہے، ٹھیک اندازہ نہین کیا جاسکتا کہ ابتدائی اشعار جو تلف ہوئے اُن کی تعداد کتنی تھی، تاہم یہ قیاس کرنا بیجا نہوگا کہ آخر کے جو اشعار اب نہین ملتے وہ کم وبیش دوسو ہونگے اور اس کے معنی یہ ہین، کہ شاعر نے اپنے ممدوح کی تخت نشینی کے بعد اس عہد کے دوسرے واقعات قلم بند نہین کئے، اور کئے بھی تو بہت سرسری طور پر ان کا ذکر کیا ہوگا،

سنۂ تصنیف اس مین شک نہین کہ امیر خسرو بنگالہ کی فوج کشی تک تغلق اول کے ہمراہ اور بادشاہ کے ندیم تھے، لیکن ان کی تاریخ وفات ۱۸ شوال ۷۲۵ھ ہجری ہے اور زندگی کے آخری چند مہینے بھی اپنے محبوب ومحترم پیر کے ماتم مین گذرے، پس یہ قول کسی قدر مشکوک معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے یہ پوری مثنوی زندگی کے اسی آخری سال مین نظم کی ہو[1]،

ادبی حیثیت بہرحال چونکہ یہ مثنوی امیر خسرو کے آخری زمانے اور پیرانہ سالی کی تصنیف ہے، دوسرے ایک ایسے بادشاہ کے ایماسے لکھی گئی جس کی نسبت مشہور ہے کہ وہ اُن کے محترم مرشد سے چندان حسنِ عقیدت نہین رکھتا تھا، بظاہر اسی لیے اس مثنوی مین وہ جوش وولولہ نہین پایا جاتا جو حضرت طوطیٔ ہند کی سب سے پہلی تاریخی مثنوی قران السعدین کا امتیاز ہے، تاہم کلام کی استادانہ پختگی اور بیان کی حیرت انگیز قوت وقدرت ہرورق سے نمایان ہے، تاریخی جزئیات کی صحت کا پاس ہرداستان سے آشکارا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جس کی بدولت یہ فخر آمیز دعوی کرنا بالکل بیجا ہوگا کہ غالبًا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایسا شاعر نہین پیدا کیا، جس نے طویل اور اہم تاریخی واقعات کو

[1] مولوی رشید احمد صاحب مرحوم نے اپنے ناتمام مقدمہ مین کشف الظنون کا یہ قول لکھا ہے کہ "یہ نظم تمام ہونے نہین پائی تھی کہ حضرت امیر کی وفات ہوگئی"، مگر کشف الظنون (مطبوعۂ لائپزگ ۱۸۳۵ء) کی جلد دوم صفحہ ۳۲۱ مین تغلق نامہ کے متعلق صرف یہ عبارت درج ہے،

"تعلق[2] نامہ خسرو الدہلوی المتوفی ۷۲۵ھ ہجری، وہو نظم فارسی فی ثلاثۃ آلاف بیت"

اس عبارت سے مولوی رشید احمد صاحب کا قیاس ثابت نہین ہوسکتا، لیکن ممکن ہے کسی دوسری جگہ کشف الظنون مین ضمناً کوئی ایسی عبارت آگئی ہو جس سے ان مرحوم نے یہ نتیجہ اخذ کیا،

[2] تغلق کے بجائے "تعلق" صریحًا کشف الظنون کے کاتب کی غلطی ہے، ۱۲

شاعرانہ حسنِ گفتار کیساتھ اتنی صحت سے نظم کا جامہ پہنانے مین کامیابی پائی ہو جیسی کہ پرانی دہلی کے اس درباری
شاعر کے حصے مین آئی[1]،

مگر جیسا کہ ہم کہہ رہے تھے، تغلق نامے مین شاعرانہ رنگینیاں کم ہین، صنائع بدائع جنہین امیر خسرو کو بڑی مہارت حاصل ہے، ان کی مثالین اتفاقی طور پر کہین کہین نظر آجاتی ہین، اور مجموعی طور پر یہ مثنوی ہندوستان کے اس ہمہ گیر ادیب کے بہترین ادبی یا شاعرانہ کارنامون مین شمار نہین ہو سکتی بلکہ یہ محض ایک بیش بہا بلند پایہ تاریخی نظم ہے۔ دوسری تاریخی مثنویون کے خلاف اس مین بہت تھوڑے زمانے کے حالات نظم کئے گئے ہین، اور سب سے بڑھ کر جو بات اس موقع پر ہم جتانا چاہتے ہین وہ یہ ہے کہ اس مثنوی کا بڑا حصہ سلطان قطب الدین کے قتل، سلاطین خلجی کے خاندان کی تباہی اور ایک ادنیٰ درجہ کے نومسلم، نو دولت کے غصب سلطنت اور پائے تخت دہلی کے مسلمانون پر مصائب و شدائد کے درد انگیز حالات پر مشتمل ہے،

نایابی کے اسباب مسلمانون کے اعلیٰ طبقات مین آج سے سو برس پہلے تک ہفت اقلیم کی بادشاہی کا جو غرور و ناز تھا اور اسی نسبت سے ان کی حمیت اور خودداری جس مرتبہ کی تھی، اگر اس کا لحاظ رکھا جائے تو یہ قیاس محض الٹنی ہو گا کہ تغلق نامہ کی سادہ بیانی سے بڑھکر، اس کا تاریخی موضوع ایسا تھا کہ آج سے چند صدی پہلے کے تعلیم یافتہ مسلمانون مین درجۂ قبول حاصل نہ کر سکا۔ ادھر پہلے تو سلطان محمد تغلق نے پائے تخت دہلی کی آبادی دکن مین منتقل کی اور اس شہر کو بالکل ویران و بے چراغ کر دیا، پھر کچھ مدت کے بعد تیمور کے خوفناک حملے اور بعد کی طوائف الملوکی کے ہنگامون مین جہان اور علم و فن کے خزانے غارت ہوئے، وہان بظاہر یہ کتاب بھی قریب قریب مفقود ہو گئی، امیر خسرو کی بعض اور تصانیف زمانے کی اس دست برد سے محفوظ نہین رہین، اور جیسا کہ بعض مبصرین کا اندازہ ہے، ان کا آدھے سے زیادہ کلام بے نشان ہو گیا، اس مین مثنوی تغلق نامہ کو بھی شامل سمجھنا چاہئے، چنانچہ اکبر کے عہد مین جب دوبارہ ہندوستان مین امن و امان اور علم و فن کا چرچا ہوا تو

[1] سر ہنری ایلیٹ نے بھی اپنی مشہور تاریخ ہند مین ایک انگریزی مستشرق کی قریب قریب یہی رائے نقل کی ہے (جلد سوم ضمیمہ)

اس وقت یہ مثنوی بہت ہی کمیاب ہو گئی تھی،

فیضی کا رقعہ اس بارے مین سب سے دلچسپ اور قیمتی شہادت ملک الشعرا فیضی کے اس رقعہ سے ہم پہنچی ہے جو اس نے راجہ علیخان فاروقی والی خاندیس کو تحریر کیا تھا، یہ رقعہ سر ہنری ایلیٹ کے کاغذات کے ساتھ متحف برطانیہ مین محفوظ ہے اور اس تک میری رہنمائی لندن یونیورسٹی کے ایک طالب علم محمد اشرف صاحب نے کی جو خود بھی غالباً امیر خسرو کی شاعری کے متعلق علمی تحقیقات کر رہے تھے، اس معاونت پر مین ان کا دل سے ممنون ہون، رقعہ کی عبارت یہ ہے:۔

"بہ سلطنت و ابہت پناہ سید الاقران راجہ علیخان فاروقی والی خاندیس"

امید کہ نواب معلی القاب مزکی اوصاف مؤید و منصور باشید، این ذرۂ بے نام و نشان خاک نشین را چہ یارا کہ دم از اشتیاق . . . . بموجب عرض رسانید عاجز نماید کہ از کتاب تغلق نامہ کہ از انفاس مقدسۂ امیر خسرو ہست، چند ورق از اول و چندے از آخر رفتہ، التفات فرمودہ دو جز از اول و ہمین قدر از آخر بہ یکے از خدمتگاران امر فرمایند کہ بہ خط مسودہ نمودہ بجہت بندہ مصحوب حاملان عریضہ فرستند، امید کہ مکارم عالیہ را عذر پذیر این جرأت و تصدیع خواہند داشت، ادام اللہ انعامکم،

العبد الاقل فیضی"

اس رقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اکبر بادشاہ کے زمانے مین کم سے کم شمالی ہندوستان مین بہت نادر الوجود تھی، دوسرے یہ کہ بظاہر شاہی کتب خانہ مین اس کا جو نسخہ موجود تھا اسکے ابتدائی اور آخری اوراق ضائع ہو گئے تھے،

صاحب فرہنگ جہانگیری اور تغلق نامہ تغلق نامہ کا جو نسخہ مؤلف فرہنگ جہانگیری، جمال الدین انجو کے سامنے تھا، ممکن ہے وہ کوئی دوسرا اور مکمل نسخہ ہو، لیکن اول تو اس نے اپنے نسخے کا جس سے کام لیا، کوئی ذکر نہین کیا، دوسرے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ فیضی کو اس نسخہ کا علم نہ ہوا ہو کیونکہ انجو اکبر بادشاہ ہی کے حکم سے اس کے آخری زمانے مین فرہنگ جہانگیری کی تالیف مین مصروف تھا، خود اس مؤلف لغت کا تغلق نامے سے کام لینا ان اشعار سے ثابت ہے جو اس نے سند

مین نقل کیے ہین، اور انھین ہم آگے اپنے ناظرین کے سامنے پیش کرین گے،

فرشتہ کا قول

اس موقع پر محمد قاسم فرشتہ کا قول بھی نقل کر دینا چاہئے، اس نے اپنی مشہور تاریخ ذکم سے کم اس کے ابتدائی مقالے) ۱۰۱۵ھ ہجری یعنی عہد جہانگیری کی بالکل ابتدا مین تحریر کئے ہین اور وہ بھی بیان کرتا ہے کہ تغلق نامہ جسے امیر خسرو نے غیاث الدین تغلق کے نام لکھا تھا کمیاب ہو گیا ہے[1]، اس مورخ نے تغلق نامہ کے چار شعر نقل کئے ہین، جن کا مولوی رشید احمد صاحب نے اپنے مقدمہ مین حوالہ دیا ہے[2]، لیکن یہ شعر معز الدین کیقباد کے حالات کی ضمن مین درج ہین، قطب الدین مبارک، خسرو خان یا خود غیاث الدین تغلق کے حالات مین اس مثنوی کا کوئی شعر نقل نہین کیا حالانکہ جابجا دوسرے اشعار اور قطعات موجود ہین، پس یہ گمان ہوتا ہے کہ خود فرشتہ نے اصل مثنوی کا مطالعہ نہین کیا یا اس کے سامنے جو نسخہ تھا وہ بھی ناقص اور ابتر حالت مین تھا،

حیاتی کا بیان

مذکورۂ بالا اسباب کو پڑھنے کے بعد حیاتی کاشی کا وہ بیان سمجھنا آسان ہو جائے گا جو اس کے سب سے پہلے نثریہ عنوان مین مذکور ہے، عنوان کی عبارت یہ ہے:-

"آغاز سخن در شرح چگونگی نظم آوردن این چند داستان و باتمام رسانیدن کتاب تغلق نامۂ سخن

---

[1] جلد اول، مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۳۲ [2] اشعار یہ ہین،

نشاید پادشہ راست بودن	نہ در عشق و ہوس پیوست بودن
بود شہ پاسبان خلق پیوست	خطا باشد کہ باشد پاسبان مست
شبان چون شد خراب از بادۂ ناب	رمہ در معدۂ گرگان کند خواب
در آئینے کہ رسم ملک داری است	ثبات کار ہا در ہوشیاری است

(فرشتہ طبع نولکشور جلد اول ص ۸۶)

تغلق نامہ مین ان اشعار کا نمبر ۲۷۹ تا ۲۰۲ ہے،

پیرائے گلزار ہر تازگی و نوی گنجور خزانۂ معنوی امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کہ نہ از نقوش دیباچہ اش اثرے بود و نہ از نگارش خاتمہ اش خبرے، نہ حدیقۂ حمد ش را در باز و نہ گلشن مدحت را دستان سرائے بآواز"

نسخہ مین "خاتمہ اش" کی بجائے "خامہ اش" درج ہے مگر یہ صریحاً کتابت کی غلطی ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ حیاتی نے صرف "این چند داستان" نظم کرنے کا دعوے کیا ہے، اور کتاب تغلق نامہ کو جس مین دیباچہ، حمد، مدح اور خاتمہ موجود نہ تھا، اتمام کو پہنچایا ہے، نہ یہ کہ پوری کتاب خود لکھنے کا ادعا کیا ہو، اپنی منظوم تمہید مین بھی حمد اور بادشاہ وقت جہانگیر کی صفت و ثنا کے بعد حیاتی لکھتا ہے کہ ۱۰۱۹ھ ہجری مین ایک رات بادشاہ نے امیر خسرو کے تغلق نامے کا ذکر کیا، ع

"کہ[1] در تاریخ سال شش صد و اند"

من جملہ اور منظوم تصانیف کے یہ کتاب بھی خسرو نے لکھی مگر اس کے آغاز و آخر کے اشعار غائب ہو گئے ہیں۔

سخن را نے نشان نے قصہ را نام	ازان دفتر ولے ز آغاز و انجام

اور اسی کمی کو پورا کرنے کا حیاتی کو حکم دیا، حیاتی کے اشعار کی تعداد اور ان کا لب لباب ہم نے اپنے خلاصۂ مثنوی مین لکھ دیا ہے، اور مولوی رشید احمد صاحب مرحوم کے ناتمام مقدمے مین بھی یہ بحث خاصی تفصیل سے موجود ہے،

حیاتی کے اشعار کی تعداد اور ان کا مسئلہ

حیاتی کے ان کل ابتدائی اشعار کی تعداد (۱۰۵) ہے، ممکن ہے کہ اس نے اخیر کے بھی کچھ شعر جنکا وعدہ کیا ہے (دیکھو بیت ۹۸ تا ۱۰۱) تحریر کئے ہون، لیکن وہ اب مفقود ہین، ان محفوظ تمہیدی اشعار کی تاریخی اہمیت اور معنوی خوبی تقریباً صفر ہے، مگر اس مین شک نہین کہ ادبی اعتبار سے یہ شعر نہایت صاف و شگفتہ ہین، کم از کم اس کے ممدوح جہانگیر کو تو وہ اتنے پسند آئے کہ اس نے

---

[1] یہ جہانگیر یا خود حیاتی کی غلطی ہے، امیر خسرو کی عمر کا بڑا زمانہ "شش صد و اند" یعنی ساتویں صدی مین گذرا، لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور خود مثنوی کے واقعات سے (جو ۷۲۰ھ میں ہوے) ظاہر ہے تغلق نامہ آٹھوین صدی کی تصنیف ہے،

حیاتی کو زر سرخ و سفید سے تلوا کر اس کے ہموزن روپیہ انعام دیا، مجمع النفائس وغیرہ تذکرون مین سعیدائے

گیلانی کا یہ قطعۂ تاریخ بھی اس واقعہ کی یادگار مین نقل کیا ہے :-

چون حیاتی را بزر سنجیدہ شاہنشاہِ عصر — بادشاہِ عدل گستر شاہ گردون اقتدار

شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ — آفتاب ہفت کشور سایۂ پروردگار

بہر تاریخش بروئے کفۂ میزان چرخ — شاعرِ سنجیدۂ شاہی، رقم زد روزگار

۱۰۱۹ھ

حیاتی کی نظم کا صحیح زمانہ

حیاتی کاشی کی نظم کا صحیح سال معلوم ہو جانے سے یہ بات بالواسطہ طور پر قطعی ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ تغلق نامہ جس سے فرشتہ نے ۱۰۱۵ھ مین چار شعر نقل کئے، حیاتی کا لکھا ہوا کلام نہین ہو سکتا کیونکہ حیاتی نے تغلق نامہ مین جو کچھ لکھا وہ فرشتہ سے چار سال بعد ۱۰۱۹ھ کی تحریر ہے،

۲- علیٰ ہذا فرہنگ جہانگیری کی تالیف اکبر کے عہد ۱۰۰۵ھ مین شروع ہوئی اور ۱۰۱۷ھ مین تکمیل کو پہنچی جنچ

"زہے فرہنگ نورالدین جہانگیر"

سال تکمیل کی تاریخ ہے، اگر تغلق نامے کا یہ نسخہ جو ہمارے سامنے ہے حیاتی کاشی کی ۱۰۱۹ھ کی تصنیف ہوتا جیسا کہ مولنا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی قیاس کرتے رہے تو ظاہر ہے کہ اس کے چند سال پہلے کی تالیف فرہنگ جہانگیری مین اس کے اشعار نقل نہین کئے جا سکتے تھے، دوسرے فرشتہ اور عضد الدولہ انجو دونون تغلق نامہ کے اشعار کو صراحۃً امیر خسرو کے نام سے نقل کرتے ہین اور یہ ناممکن ہے کہ انھون نے اپنے ہمعصر حیاتی کے کلام کو امیر خسرو سے منسوب کر دیا ہو،

تغلق نامے کے اشعار فرہنگ جہانگیری مین

فرشتہ کے اشعار ہم اوپر نقل کر چکے ہین، ذیل مین وہ اشعار نقل کرتے ہین جو ایک سرسری تلاش سے فرہنگ جہانگیری مین صراحۃً امیر خسرو کے نام سے ہمین دستیاب ہوئے اور جو ہمارے نسخۂ تغلق نامہ مین موجود ہین،

لہ خزانۂ عامرہ کے تذکرے مین جہان حیاتی کاشی کو انعام دینے کا ذکر لکھا ہے وہان یہ بھی لکھا ہے کہ حیاتی کاشی نے تغلق نامہ کی صرف ایک گم شدہ داستان نظم کی تھی،

اشعار تغلق نامہ جو فرہنگ جہانگیری (مطبوعہ ۱۸۷۶ء مطبع ثمر ہند لکھنو) مین سنداً نقل کئے گئے ہین،

صفحہ فرہنگ جہانگیری	لفظ جسکے تحت شعر لکھا گیا ہے	حوالہ بیت تغلق نامہ	شعر
۲۳۲	خراب	۲۸۱	شبان چون شد خراب از بادۂ ناب — رمہ در سعدۂ گرگان کند خواب
۴۰۵	مردم	۲۸۶	نشاید ہیچ مردم خفتہ در کار — کہ در پایان پشیمانی دہد بار
۳۲۸	چرخ	۶۱۱	کسے کش چشم زخم از چرخ روزی است — رسد گر خش جہان چرخ دوزی است
۳۲۸	”	۶۱۲	چو زخم از تیر بے تدبیر چرخ است — نہ کمتر تیر چرخ از تیر چرخ است
۴۲۰	خزانہ	۱۱۷۶	ولایت دارم و گنج و خزانہ — سپاہے تیز چون باد بزانہ
۴۰۴	لُر	۱۲۱۱	ملک کز لشکر آفت سگالش — چو موئے سر پریشاں دید حالش
”		۱۲۱۲	ترش رو بود چون افغان جنگی — وے ہم چون کلاہِ لُر بہ تنگی
۱۷۴	شارک	۱۶۱۴	اگر شاہیں زبون گردد ز شارک — کلہ گل مرغ را زیبد تبارک
۹۱	باخہ	۱۸۷۱	لبا بر دل نہنگ از تیغ کینہ — کہ بر دزدیدہ چون باخہ سینہ
			(نوٹ) شمس اللغات چھاپۂ بمبئی صفحہ ۱۱۲ مین بھی یہ شعر امیر خسرو کے نام سے درج ہے
۱۴۴	دار	۲۱۳۸	خورش در دہلی و جان را در داد — تنش در شہر و جان در دار مندو
۴۰۴	لر	۲۱۵۴	لرے کروند ناہموار در پیش — کہ باد از سر برآید در تنگ خویش
۱۲۷	تار = تال	۲۱۹۶	ز سیری بس کہ ہند و سیر خور شد — ہمہ تال برنجش تال زر شد
۱۲۰	پاگاہ	۲۸۴۹	رمہ گرگاں ربانید از سپاہش — فرس دزداں برند از پایگاہش

ذیل کے دو شعرون کے متعلق جو تغلق نامہ کے بیت نمبر ۴۶۴ و ۹۹۴ ہین فرہنگ جہانگیری جلد اول صفحہ ۱۵۴ مین یہ عبارت لکھی ہے۔

"بحکم (امیر) خسرو این مثنوی را در گور کردن پسران سلطان السلاطین رقاب الامم ملوک الشرق و العجم علاء الدین والدنیا گفتہ:-

یکے کو بر کشید این دیدہ ا سر | بسان خستہ شفتالو بود تر
دو چشم او چو دو عناب خستہ | ہمیشہ خستہ و در خون نشستہ"

تغلق نامہ کی دوبارہ نایابی لیکن حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ جہانگیر کی اس قدر دانی اور کاوش کے باوجود تغلق نامہ کا یہ نسخہ بھی، جس کی حیاتی نے تمہید لکھی تھی، ملک میں رواج نہ پا سکا، اور بعد کی تاریخون اور تذکرون مین اس کا بہت ہی مجمل ذکر یا صرف نام باقی رہ گیا ہے، اسی سلسلے مین مجھے متحف برطانیہ مین نواب ضیاء الدین خان نیّر دہلوی کی ایک تحریر ملی جو انھون نے امیر خسرو کے حالات اور تصانیف کے متعلق بطور یادداشت قلم بند فرمائی تھی، یہ غالباً ۱۸۴۳ء کی تحریر ہے،

نواب ضیاء الدین خان کا بیان اور سر ہنری ایلیٹ کے ذخیرے کے ساتھ متحف مذکور مین داخل ہوگئی ہے، نواب صاحب موصوف نے منجملہ اور تاریخی مخطوطات کے امیر خسرو کی تاریخی مثنوی خزائن الفتوح کا ایک نسخہ سر ہنری ایلیٹ کو دیا تھا اور اسی فاضل انگریز کی فرمائش سے خود اپنے قلم سے امیر خسرو کے حالات بھی لکھ کر بھیجے تھے، اس مین نواب صاحب موصوف لکھتے ہین :-

"مثنوی نہمین تغلق نامہ است کہ در حال تغلق شاہ تصنیف نمودہ کہ بس عدیم الوجود است و آخرین تصنیفات اوست"۔

پھر حاشیہ پر یہ سطر تحریر کی ہے :-

"ہمگی کتب مذکورہ مصنفۂ امیر خسرو بجز تغلق نامہ کہ خبر اسمی مسمّی ندارد نزد این احقر العباد موجود"

تغلق نامہ کی دریافت اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی گذشتہ دو صدی مین بھی نایاب رہی اور ۱۹۱۴ء مین جب نواب اسحاق خان مرحوم نے کلیات خسرو کی تلاش اور طبع کا وسیع پیمانے پر اہتمام کیا، تو اس وقت بھی ہندوستان

یا بیرونی ممالک کے کسی مشہور کتب خانے مین اس کتاب کا پتہ نہین چلا، اور یہ محض ایک نادر اتفاق تھا کہ یہ مثنوی مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی رئیس حبیب گنج کے ذاتی کتب خانے سے او جہانگیر نامہ کے نام سے برآمد ہوئی، مولانا شروانی صاحب کو ایک مدت تک یہ شبہہ رہا (اور شاید اب بھی ہو) کہ یہ کتاب حقیقت مین امیر خسرو کا تغلق نامہ ہے یا حیاتی کاشی کی بعد کی نظم، لیکن دنیائے ادب کو مولوی رشید احمد صاحب انصاری مرحوم کا احسان مند ہونا چاہئے جنھون نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ حیاتی کاشی کی تمہید کے ساتھ اصلی تغلق نامہ یہی ہے، اس عظیم الشان "دریافت" کا فخر انھی مرحوم کو حاصل ہے، پھر انھون نے شروانی صاحب کے نسخے کی اپنے قلم سے نقل کی اور اس پر ایک مقدمہ بھی تحریر کیا جو پورا نہ ہونے پایا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا،

نواب اسحاق خان کے انتقال سے کلیات خسرو کی طبع و اشاعت کا کام بھی معرض التوا مین پڑ گیا، اور تغلق نامہ کو شاید اس واسطے اور بھی نظر انداز کر دیا گیا کہ اس کی اصلیت ہی مشکوک و مشتبہ تھی۔

تین سال ہوتے ہین کہ مولوی رشید احمد صاحب مرحوم کا نسخہ ان کے داماد کی وساطت سے میری نظر سے گذرا اور محض کتاب کی چند داستانین پڑھ کر ہی مجھے یقین ہوگیا کہ یہ امیر خسرو کی گم شدہ مثنوی ہے، یورپ کے سفر مین بھی یہ نسخہ میرے ساتھ تھا اور مین نے کوشش کی کہ وہان کے کسی کتب خانے مین اس کا دوسرا نسخہ ناقص یا کامل ملسکے تو بہم پہنچایا جائے لیکن اس تلاش مین کامیابی نہ ہوئی، اور آخر مین یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ مجلس مخطوطات فارسیہ کی طرف سے مولوی رشید احمد صاحب کا نسخہ خرید لیا جائے اور مولٰنا شروانی صاحب کے اصلی نسخے سے اس کا مقابلہ کر کے یہ کتاب بجنسہ چھاپ دی جائے،

مولوی رشید احمد صاحب مرحوم کا ناتمام مقدمہ بھی کتاب کے ساتھ چھاپا جا رہا ہے، اور مثنوی کے تاریخی واقعات کا ایک خلاصہ مین نے لکھ کر مقدمہ کے بعد شامل کتاب کر دیا ہے،

کتاب کی تاریخی اہمیت تغلق نامہ کی تاریخی اہمیت، اصل مثنوی بلکہ محض اس کے اردو خلاصہ کے مطالعہ سے انجم ہوگی، لیکن یہان مین خاص طور پر اس کی ایک خصوصیت بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہون اور وہ یہ ہے کہ اس

مثنوی مین سلطان قطب الدین کے قتل، خاندان علائی کی تباہی، خسرو خان کی چند روزہ بادشاہی، تغلق کی سرتابی، بعض امراسے خط وکتابت، دہلی پر چڑھائی اور دو بڑی لڑائیون کے بعد فتح یابی، خسرو خان اور اس کے بھائی کی گرفتاری اور قتل کئے جانے کے متعلق ایسے صحیح اور تفصیلی حالات ملتے ہین جو کسی دوسری تاریخ مین موجود نہین ہین، افریقی سیاح ابن بطوطہ کا بیان بے ربط اور مجمل ہے اور ہمین اس سے زیادہ توقع رکھنے کا حق بھی نہین ہے،

برنی کی تاریخ اور غلطیان

لیکن ضیاء الدین برنی جکی تاریخ محفوظ ہے اور جو ان تمام واقعات کے وقت خود دہلی یا اس کی نواح مین موجود ہوگا، افسوس ہے کہ اس نے بھی ان واقعات کو کچھ اچھی طرح اور پوری صحت و وضاحت کے ساتھ قلمبند نہین کیا، اور اس کی تاریخ مین ان واقعات کا کوئی صحیح مہینہ بلکہ سنہ تک درج نہین ہے، خسرو کی بادشاہی کا زمانہ اس نے ایک جگہ "چار ماہ" اور دوسری جگہ "سہ چار ماہ" لکھدیا ہے[1]، معلوم ہوتا ہے اس کی اسی بے احتیاطی سے بعد کے اکثر تاریخ نگارون کو طرح طرح کے مغالطے ہوئے اور قطب الدین کے قتل سے محمد تغلق کی تخت نشینی تک جملہ واقعات کی تاریخین گڈمڈ ہوگئی ہین،

اہم واقعات کی صحیح تاریخین

پس تغلق نامے کے مل جانے سے ہماری تاریخ کا یہی فائدہ کچھ کم نہین کہ اس مثنوی کی بدولت سب تاریخون کی تصحیح ہوجاتی ہے کیونکہ امیر خسرو نے نہایت صراحت سے لکھا ہے کہ قطب الدین کا قتل جمادی الثانی سنہ ۷۲۰ھ کی مین چاندرات کو واقع ہوا[2]۔

"چون تاریخ عرب شد بقصد ولبت | نبات قطب کم شد جانب زیست
جمادو دو مین را شد پدیدار | ہلال تیرہ و تاریک دیدار
شد آن مہ برہمہ گیہان مبارک | گر بر طالع سلطان مبارک"

(نمبر ۳۴۵ و نمبر ۳۴۶ و نمبر ۳۴۷)

[1] برنی مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی صفحہ ۴۱۱ و ۴۱۲، [2] سیر الاولیاء اور حضرت سلطان المشائخ کے بعض دوسرے تذکرون مین بھی یہ بات ضمناً تحریر ہے کہ سلطان قطب الدین چاندرات کو مارا گیا، لیکن ان تذکرون مین صحیح مہینہ درج نہین ہے،

اور ٹھیک دو مہینے بعد غازی ملک تغلق غاصب خسرو خان کو شکست دے کر پہلی شعبان سنہ ۷۲۰ ہجری کو تخت دہلی پر متمکن ہوگیا،

چو صبح غرۂ شعبان فرخ | نمود از تخت گاہ آسمان رخ

(۲۵۹۹ تا آخر داستان)

یہ ہفتے کا دن تھا اور خسرو خان سے آخری لڑائی اس سے ایک دن پہلے یعنی جمعہ کو ہوئی تھی،

"ہمہ شب بود خسرو لشکر آرائے | سران و سرکشانش نیز بر پائے
چو صبح جمعہ تیغ تیز برداشت | زمانہ غلغل خون ریز برداشت"

(نمبر ۲۲۴۵ و ۲۲۴۶)

دن کا ذکر برنی اور بعد کے مورخون نے بھی کیا ہے کہ لڑائی جمعہ کو ہوئی اور دوسرے دن تغلق تخت نشین ہوا، مگر ان مین سے کوئی بھی صحیح تاریخ نہین لکھتا،

اس عہد کے رسل و رسائل

اس اہم تاریخی اطلاع کے بہم پہنچ جانے کے بعد ہمین یہ اندازہ کرنے کا بھی موقع ملتا ہے کہ اس زمانے مین رسل و رسائل کا کس قدر عمدہ انتظام تھا کہ صرف دو مہینے کے اندر تغلق بعض اور ہمخیال امیرون کی فوج لے کر دیپالپور سے لڑتا بھڑتا پائے تخت دہلی تک پہنچ گیا، حتیٰ کہ شروع مین راقم الحروف کو اس دو مہینے کی مدت کو تسلیم کرنے مین اسی لیے تامل تھا کہ اتنے قلیل زمانے مین غازی ملک تغلق کو دور دور کے صوبہ دارون سے خط وکتابت کرنے کی مہلت کیونکر ملی، امیر خسرو نے ان صوبہ دارون کے نام اور مقام اور ان کی مکاتبت کا حال خاصی تفصیل سے تحریر فرمایا ہے، (۱۰۷۲ تا ۱۳۱۵)

پائے تخت دہلی سے خود تغلق کا مستقر (دیپالپور) دو سو میل سے زیادہ فاصلہ پر تھا اگرچہ اس کے صوبہ کی حدود سرستی ندی یعنی موجودہ شہر حصار کے قریب تک پھیلی ہوئی تھیں جس کا فاصلہ دہلی سے سو میل سے بھی کم ہے،

جن صوبہ دارون کو تغلق نے خط لکھکر خسرو خان کی مخالفت پر ابھارا ان مین سب سے زیادہ دور سہوان (موجودہ

ضلع (لڑکانا صوبہ سندھ) اور جالور (ریاست جودھپور) کے مقطعے یا والی تھے، نقشے مین دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ دیپالپور سے سہوان کا فاصلہ تقریباً (۴۲۵) میل اور جالور کا (۴۰۰) میل کے قریب ہے، ڈاک چوکی کے عمدہ انتظام کی بدولت اتنے دور کے مقامات تک سرکاری ڈاک کا ہفتہ عشرہ مین پہنچ جانا خلاف قیاس نہین اور ابن بطوطہ کے سفرنامے، نیز برنی وغیرہ مورخون کی تحریرون مین ایسی نظیرین بھی ملتی ہین کہ سرکاری ہرکارون نے اس سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام تک اطلاعات پہنچا دین، جیسا کہ مثنوی یا اس کے خلاصے سے معلوم ہوگا، تغلق نے جن صوبہ دارون کو خط لکھے تھے ان مین سے صرف ایک شخص بہرام ایبہ نے اپنی فوج کے ساتھ دہلی پر لشکر کشی مین کارگر حصہ لیا، اسی بہرام کو بعد مین کشلے خان کا خطاب اور پورے سندھ اور ملتان کی صوبہ داری عطا ہوئی تھی،

کتاب کے ادبی محاسن یا صنائع بدائع پر مین نے کچھ نہین لکھا، تغلق نامہ مین ایسے صنائع بہت کم ہین اور مصنف علیہ الرحمۃ کے ان کمالات پر زیادہ واقف اہل ذوق کلیات خسرو کے بعض دیباچون مین بہت کچھ لکھ چکے ہین، البتہ مختصر طور پر یہ لکھنا باقی ہے کہ مولوی رشید احمد صاحب مرحوم کا نسخہ مجلس مخطوطات کے لیے خریدے کے بعد اس کی اصل کتب خانہ حبیب گنج سے منگائی گئی اور مخدومی مولانا شروانی رئیس حبیب گنج کی عنایت سے تغلق نامہ کا یہ دنیا مین واحد نسخہ کئی ہفتہ میرے پاس رہا، اس عنایت پر مین مجلس کی طرف سے جناب ممدوح کا شکریہ عرض کرتا ہون،

نسخۂ حبیب گنج

حبیب گنج کے اس نسخہ مین بھی کاتب کا نام یا کتابت کا سنہ درج نہین ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا آخری اوراق مفقود ہین، آخری صفحہ پر ترک موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے ضرور کم سے کم ایک یا زیادہ اوراق موجود تھے، اسی خاتمۂ کتاب سے چند ورق پہلے حاشیہ پر ایک عنوان کا شعر تحریر ہے، یہ اسی بحر و قافیہ مین ہے جسمین تغلق نامہ کی داستانون کے دوسرے عنوانات لکھے گئے ہین،

"محمد بہ چتر و کشور دادن شہزادگان آنگہ — بشغل آراستن کار ملوک و بندۂ [1] چاکر"

[1] ک: بندہ و چاکر ۱۲

اس عنوان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم ایک داستان امیر خسرو کی لکھی ہوئی اور موجود تھی جسمین تغلق کی تخت نشینی کے بعد ملوک و امرا کے جدید مراتب و مناصب پانے کا حال تحریر تھا،

نسخے کے اوراق بھی بعض جگہ گڈمڈ ہوگئے ہین، مگر ان کا سلسلہ تھوڑے سے تردد و تجسس کے بعد مل جاتا ہے کتابت کی بیشمار غلطیان پائی جاتی ہین جنمین بہت سی مولوی رشید احمد صاحب مرحوم نے اپنی نقل مین درست کردی تھین اور ہم نے اس اصلاح سے کافی استفادہ کیا، کتاب کو بار بار محنت اور غور کے ساتھ پڑھنے سے بہت سی دوسری غلطیان بھی صاف ہوگئین، مگر سوائے بالکل صریحی اور یقینی اغلاط کے ہم نے متن مین ہر جگہ نسخۂ حبیب گنج کی کتابت کی بجنسہ نقل کردی ہے، اور مولوی رشید احمد صاحب یا اپنی قیاسی تصحیح کو حاشیے مین لکھا ہے، کتاب کی آخری خواندگی اور تصحیح مین مولانا احتشام الدین صاحب حقی دہلوی سے نہایت مفید مدد اور مشورے ملے جس کے لیے مین ان کا منت گذار ہون، ہر بار کی خواندگی اور تصحیح مین مولوی رشید احمد صاحب حیدرآبادی جو مجلس مخطوطات کے دفتر مین کام کرتے ہین، برابر میرے معین و شریک کار رہے اور بعض عمدہ مشورون سے مجھے ممنون کیا،

نسخۂ حبیب گنج کے ایک صفحے کا عکس لے کر شامل کتاب کر دیا گیا ہے، جس سے اس کی تقطیع اور خط کا اندازہ ہوگا، یہان اتنا اور لکھ دینا چاہئے کہ اس نسخے کے سرورق پر یہ الفاظ تحریر ہین،

"جہانگیر نامہ عطائے حیاتی کاشی"

"اللہ اکبر"

دہلی خانقاہ قطب صاحب،

"مرزا اسکندر بخت،"

پہلے جملے سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید یہ نسخہ خود حیاتی کاشی نے لکھوا کر اپنے کسی دوست کو عطا کیا تھا، مگر افسوس ہے اس کی بعد کی سرگذشت نامعلوم ہے اور خود "مرزا اسکندر بخت" کے متعلق بجز اس صریحی قیاس کے کہ تیموری خاندان کے شہزادے ہونگے، اور کچھ حالات معلوم نہین ہوئے، نسخہ مجلد ہے اگرچہ جلد کچھ بہت پرانی نہین ہے

البتہ کاغذ یقیناً کم وبیش دو تین سو سال کا پرانا معلوم ہوتا ہے، جگہ جگہ سے کرم خوردہ اور کہین کہین پانی کی سیل کا نشان بھی موجود ہے، کل صفحات (۱۹۷) ہین، نثر کا پہلا عنوان اور بعد کے منظوم عنوانات، نیز کہین کہین بعض نام سرخی سے لکھے ہوئے ہین،

آخر مین دولت آصفیہ دام اقبالہا کا شکریہ ادا کرنا فرض ہے جس کی امداد سے مجلس مخطوطات فارسیہ اس قابل ہوئی کہ اس نادر ونایاب تاریخی مثنوی کو دنیاے علم کے سامنے چھاپ کر پیش کرتی ہے،

شیخ سعدی کا تخلص "سعدی" کس کے نام پر ہے؟

از

جناب مولوی محمد اعجاز حسن خان صاحب ممتاز رئیس پٹنہ،

شیخ سعدی کے معاصر شمس بن قیس رازی کی تصنیف المعجم فی معائیر اشعار العجم میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی کے ترتیب وتحشیہ سے شائع ہوئی ہے، اس پر میرزا صاحب کا ایک بسیط عالمانہ مقدمہ بھی ثبت ہے،

اس مقدمہ مین میرزا صاحب موصوف نے شیخ سعدی کے تخلص پر اس تقریب سے نظر ڈالی ہے کہ اس معاصر کتاب مین سعدی کے شعر کیون نہیں ہین، اور اس سے یہ نتیجہ پیدا کیا ہے کہ شیخ سعدی کا تخلص ابوبکر بن سعد بن زنگی بادشاہ فارس کے بیٹے شاہزادہ سعد بن ابوبکر کے نام سے ماخوذ ہے، اس کے دادا سعد بن زنگی کے نام سے نہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہین:۔

"ودرین جا لازم ست کہ اشارہ بغلطی مشہور در باب تخلص سعدی شیرازی بنمائیم، وآن این است کہ بسیارے از تذکرہ نویسان کہ اولین شان دولت شاہ سمرقندی ست، گفتہ اند کہ شیخ از مداحان اتابک سعد بن زنگی بودہ، ووجہ تخلص او بسعدی نیز از نام ہمین بادشاہ ماخوذ ست، واین امر خطاے محض ست، چہ اولاً در تمام کلیات شیخ مدحے یا ذکرے از سعد بن زنگی اصلاً ومطلقاً نیست، ثانیاً مصنف این کتاب چنانکہ گفتیم در پنج سال آخر سلطنت سعد بن زنگی واوائل سلطنت ابوبکر بن سعد بن زنگی در شیراز ودر ملازمت دو بادشاہ مذکور بسری بردہ است، ودرین کتاب (یعنی المعجم فی معائیر اشعار العجم) از اشعار غالب شعراے متقدمین ومتاخرین عصر خود مانند کمال الدین اسمٰعیل متوفی در سنہ ۶۳۵ھ استشہاد آوردہ است،

ومع ہذا ہیچ اشارہ و ذکرے از سعدی نمی کند، دگر شیخ معاصر سعد بن زنگی بودہ یعنی در عہد او بشیراز اقامت

داشتہ ایں سکوت مصنف از وبا آن کہ ہر دو بنا بر ایں تقدیر در یک عصر و یک شہر و در خدمت یک بادشاہ

بسری بردہ اند، ہیچ وجہے و محلے نخواہد داشت، وصواب قول صاحب تاریخ گزیدہ است کہ شیخ از ملازمان

سعد بن ابوبکر بن سعد بن زنگی (کہ در ۶۵۸ھ دوازدہ روز بعد از وفات پدرش وفات یافت) بودہ است و تخلص سعدی نیز از

نام ہمیں شاہزادہ ماخوذ است و کتاب گلستان را نیز بنام ہمو تالیف کردہ است چنانچہ گوید،

علی الخصوص کہ دیباچۂ ہمایونش   بنام سعد ابوبکر سعد بن زنگی است

وظاہر آنست کہ مراجعت شیخ از سفرہاے دور و دراز بوطن خود و استقرار وے در شیراز در اواخر سلطنت

ابوبکر بن سعد بن زنگی بودہ است، و درہماں اوقات کتاب بوستان را بنام آں بادشاہ در ۶۵۵ھ تالیف

کردہ است چنانکہ گوید،

زشش صد فزوں بود پنجاہ و پنج   کہ پر در شد ایں نامبردار گنج

و گلستان را در سال بعد یعنی ۶۵۶ھ چنانچہ گوید،

دراں مدت کہ مارا وقت خوش بود   زہجرت شش صد و پنجاہ و شش بود

و چوں سلطنت ابوبکر بن سعد بن زنگی مدت سی سال یعنی از ۶۲۸ھ الی ۶۵۸ھ طول کشید منافاتے

ندارد کہ شمس قیس و شیخ سعدی باوجود آنکہ ہر دو معاصران بادشاہ بودہ اندزمان یکدگر را درک نکردہ

باشند چہ شمس قیس اوائل عہد او ادرک کردہ باشد و شیخ سعدی اواخر آنرا واللہ الہادی الی الصواب

ہماری تحقیق مین اگر شیخ کا تخلص سعد کے نام سے ماخوذ سمجھا جائے تو وہ سعد سعد بن زنگی ہے جیسا کہ دولتشاہ

نے لکھا ہے نہ کہ سعد بن ابوبکر،

صاحب مقدمہ نے دولتشاہ کے قول کو خطاے محض لکھا ہے، لیکن ہمارے خیال مین خود صاحب مقدمہ

کا بیان خطاے محض ہے، چونکہ یہ دعویٰ چند دلائل پر مبنی ہے، اس لیے ناظرین پہلے چند امور تنقیح طلب کی تصریح و

تشریح کو بغور ملاحظہ فرمائین، پھر اصل حقیقت خود بخود بے نقاب ہوجائے گی،

۱۔ شیخ سعدی کی معاصرت شاہزادہ سعد بن ابوبکر کے ساتھ ہونا مسلم ہے، مگر یہ معاصرت ایک پیر کہن سال

کی ایک شاہزادہ جوان سال کے ساتھ تھی، یا دونون معاصر ہمعمر بھی تھے،

۲۔ شیخ سعدی کی عمر کتنی ہوئی، اگر صحیح عمر کا پتہ نہ لگ سکے تو شیخ کے حالات و واقعات سے اندازہ کرنا چاہیے

جو انھون نے اپنے تصنیفات مین بیان کئے ہین،

۳۔ شیخ نے اتابکان فارس مین سے کس کس بادشاہ کا زمانہ پایا،

۴۔ شاعر کب تخلص اختیار کرتا ہے،

۱۔ کتب تاریخ اور شیخ کے کلام کی تصریحات صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ کی معاصرت شاہزادہ سعد کے ساتھ ایک پیر کہن

سال اور ایک نوجوان سال کی معاصرت تھی، شاہزادہ سعد اپنے باپ ابوبکر بن سعد کی وفات کے بارہ دن بعد ۶۵۸ھ[1]

مین انتقال کر گیا، باوجود کوشش مجھکو شاہزادہ کی پیدایش کا سنہ معلوم نہ ہوسکا جس سے اسکی عمر کا اندازہ ہوتا لیکن

یہ معلوم ہے کہ بادشاہ ابوبکر بن سعد زنگی ساٹھ اور ستر برس کے درمیان عمر پاکر ۶۵۸ھ مین مرا، اس کا بیٹا سعد عالت نوجوانی

مین ایک بچہ چھوڑ کر مرا، شیخ سعدی نے نہایت دردناک مرثیہ اس کی وفات کی خبر پاکر لکھا ہے، جو اُن کے کلیات مین

موجود ہے، اس مرثیہ کے ان اشعار اور تاریخ کے بعض دوسرے حوالون سے یہ آشکارا ہوتا ہے کہ شیخ اپنا تخلص اس

شاہزادہ کے نام پر نہین رکھ سکتے تھے، بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک پیر کہن سال شاعر ایک نوعمر شاہزادہ کے نام پر اپنے

تخلص کی بنیاد قائم کرے، شیخ کا کمال اور اُن کی شاعری اور اس کی شہرت شاہزادہ کی پیدایش کے پہلے اور بہت

پہلے تمام دنیا مین پھیل چکی تھی،

۲۔ شیخ کی ولادت کا سال کسی کتاب مین نظر سے نہین گذرا، حیات سعدی مین ایک یورپین مصنف کا قول

۵۸۹ھ نقل کیا ہے، مگر یہ محض غلط ہے، مولانا حالی مرحوم نے بھی اس کی تردید کی ہے، مگر شیخ کی ولادت کا سال

[1] تاریخ روضۃ الصفا ص ۹۷، مطبوعہ نولکشور پریس،

میری طرح مولنا حالی کو بھی معلوم نہ ہو سکا، وفات کا سال ۶۹۱ھ ہے، اس پر مورخین کا اتفاق ہے، مگر صاحب تاریخ گزیدہ ۶۹۰ھ لکھتے ہیں، جب ولادت کا سال معلوم نہیں تو عمر کی تحدید کی تحقیق نہیں ہو سکتی، لیکن بعض محققین کے نزدیک شیخ کی عمر ایک سو بیس برس کی ہوئی، مولانا حالی اسی کو صحیح جانتے تھے، حیات سعدی میں تحریر فرماتے ہیں :-

"جہانتک ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے، حضرت شیخ نے ۱۲۰ ایکسو بیس برس اس قفس عنصری مین بسر کیے ہین"

علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم مین ایک سو بیس برس کی عمر کو خلاف قیاس تحریر فرمایا ہے، فرماتے ہین :

"بعض تذکرون مین شیخ کی عمر ۱۲۰ لکھی ہے اگرچہ یہ خارج از قیاس عمر تسلیم کر لیجائے تو اور واقعات کی کڑیان مل جائین گی لیکن ایک سخت دقت پھر بھی باقی رہتی ہے وہ یہ کہ شیخ نے گلستان مین لکھا ہے کہ جس زمانہ مین سلطان محمود خوارزم شاہ نے خطا سے صلح کی مین کاشغر مین آیا" سلطان محمود ۵۹۸ھ مین مرا ہے، اس لیے اس زمانہ مین اُن کی عمر ۱۰ برس کی ہو گی، لیکن واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے، کہ شیخ کی شاعری اور کمالات نے کم از کم ۳۰-۴۰ برس کی عمر مین شہرت پائی ہے، اسلئے یا تو شیخ نے غلطی سے علاؤالدین تکش خوارزم شاہ کے بجائے محمود خوارزم شاہ کا نام لکھدیا ہے، یا ان کی شاعری کی شہرت ان کے شباب ہی مین ہو چکی تھی"

علامہ موصوف جیسے وسیع النظر دقیقہ رس محقق کا اس طرح لکھنا سوائے سہو فکر کے اور کیا ہو سکتا ہے، قدما کی تاریخ اور اُن کی تصنیفات مین جو بعض اکابر سلف کی عمرین ایک سو بیس برس کی لکھی ہوئی ہین یا اس سے زیادہ لکھی گئی ہین اُن سے قطع نظر کرکے مین اپنے زمانہ مین بھی ایسے بزرگون کے نام بتا سکتا ہون جن کی عمرین ایک سو بیس برس یا اس سے زیادہ ہوئین، حضرۃ الاستاذ مولنا الحافظ السید فرزند علی نقشبندی مجددی دہلوی ثم المدنی علیہ الرحمہ کے شیخ طریقت حضرت اقدس سید محمد حبیب اللہ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی عمر ایک سو تیئس برس کی ہوئی، آپ اپنے پیر کے بارے مین تحریر فرماتے ہین جو کتاب خزینۃ البرکات مین مرقوم ہے :

"از فضائل و کرامات و برکات ایشان ہمین قدر نوشتہ میشود کہ باوجود ضعف قوئے و کبر سن

کہ یک صد و پانزدہ تا این تاریخ کہ سنہ ہزار و سہ صد و نہ ۱۳۰۹ ہجری ست رسیدہ قیام بکثرت نوافل و طاعات و اختیار عزیمت بر رخصت و استقامت بر شریعت و اتباع سنت میدارند"

اس کتاب خزینۃ البرکات کی تصنیف و اشاعت کے برسون بعد حضرت کا انتقال تاریخ ۲ محرم ۱۳۱۸ھ مین ہوا، اس حساب سے حضرت کی عمر ۱۳۱۸ھ مین ایک سو تیئس برس کی یا اس کے لگ بھگ مگر ایکسو بائیس برس سے یقیناً زیادہ ہوئی، حضرت مولنا فضل رحمٰن علیہ الرحمہ کی درازی عمر پوشیدہ نہین، اگر تلاش و تجسس سے کام لیا جائے تو اسوقت بھی ایسے معمرین ملین گے جن کی عمرین سو برس اور سو برس سے زیادہ ہونگی، ہوش و حواس کیساتھ قوت گفتار و رفتار بھی ہوگی، زارو آغا ترک کا حال انگریزی[1] اور ہندوستانی اخبارون مین چھپا تھا، اس کی عمر ۱۹۳۰ء مین ایک سو ساون سال کی تھی، راقم الحروف نے بھی ایک سو بیس برس سے زیادہ عمر کے آدمی کو دیکھا ہے، اور سو برس کے لگ بھگ یا اس سے زیادہ عمر کے چند اشخاص کو دیکھنے کی نوبت آئی ہے[2]، میرے مخدوم اور حضرت الاستاذ کے ہمنام مولنا شیخ فرزند علی ساکن سرایا ضلع دربھنگہ علیہ الرحمۃ جو ان کے پیر بھائی بھی تھے ستانوے برس کی عمر مین باوجود اس کے کہ ایک بار فالج کا مرض ہو گیا تھا اس سے بالکل صحت پا کر اکثر سیر و سیاحت مین مصروف رہتے تھے، میرے غریب خانہ پر بھی بارہا تشریف لاتے تھے، ان کو دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ اکابر سلف کی درازی عمر و صحت قوئے کا جو ذکر کتابون مین لکھا ہے وہ بالکل سچ ہے، اگر خالق کائنات نے اُن کی عمر ایک سو بیس برس کی معین کی ہوتی تو اس عمر کو پہنچکر بھی وہ ایسے ہی ہوتی

[1] اخبار اسٹیٹسمین مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۳۰ء میں زارو آغا کا حال شائع ہوا ہے کہ یہ ترک قسطنطنیہ شہر کے سیٹی ہال کا دربان تھا،

[2] میں نے ایک گاؤں میں ۱۲۶ برس کے بڈھے کو دیکھا جس کو دوبارہ دانت سو برس کے بعد نکلے تھے، میرے سامنے چنے چبانا تھا، اگلے وقتوں کے حالات بیان کرتا تھا، مگر چلنے کی قوت نہیں تھی، اس کی اولاد نے گاڑی بنا دی تھی، اسی پر چڑھکر میرے پاس آیا تھا، خوشحال کثیر الاولاد تھا، کئی برس بعد مرا، تھوڑا زمانہ گذرا کہ اس شہر عظیم آباد میں ایک رفوگر ۱۱۶ برس کی عمر پا کر مرے، اس شہر میں کئی آدمی ایسے دیکھے اور سنے جن کی عمریں سو برس سے زیادہ تھیں، گھر کا کام کاج سب اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے، بعض کپڑے بھی سی لیتے تھے، ایسے لوگوں کے نام اور حالات لکھے جائیں تو ایک کتاب بنجائے،

دور سمجھ ہے، مگر افسوس کہ سو برس تک نہ پہنچ سکے کلکتہ کے سفر سے واپس آنے پر مرض فالج دوبارہ ہونے پر انتقال کر گئے رحمۃ اللہ علیہ، خود شیخ نے ایک عجمی کے متعلق گلستان میں ایک حکایت بیان کی ہے کہ وہ جامع دمشق مین بیٹھے چند علماء کے ساتھ بحث مین مشغول تھے کہ ایک جوان آیا اس نے کہا:-

"درمیانِ شما کسے ہست کہ زبان فارسی داند، اشارہ بمن کردند، گفتم خیر است، گفت پیرے صد و پنجاہ سالہ در حالت نزع ست و چیزے میگوید کہ مفہوم مانمی گردد، اگر بکرم قدم رنجہ فرمائی مزد یابی" الخ...

شیخ نے اپنے خاندان کے ایک پیر کہن سال کا ذکر ایک قطعہ مین کیا ہے جو ان کے دیوان مین موجود ہے، دو شعر اس قطعہ کے یہان پر لکھے جاتے ہین،

پیرے اندر قبیلۂ ما بود کہ جہان دیدہ تر ز عنقا بود

صد و پنجہ بزیست با صد و شصت بعد ازاں پشتِ طاقتش بشکست

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے قبیلہ کے علاوہ اور لوگون کی عمرین بھی عراق عجم مین زیادہ ہوئی ہین، شہر شیراز جو شیخ کا جنم بھوم تھا اس مین ایک پیر کہن سال کا ذکر ضمناً بوستان کی ایک حکایت مین آگیا ہے، فرماتے ہین[1]،

شنیدم ز پیران شیرین سخن کہ بود اندرین شہر پیرے کہن

بسے دیدہ شاہان و دوران وامر سرآوردہ عمرے ز تاریخ عمرو

عمرو سے عمرو بن لیث مراد ہے، جو صفاریون مین نامی بادشاہ گذرا ہے، اس کی جامع عتیق شیراز مین مشہور عمارت تھی، اس کی وفات تیسری صدی ہجری کے اخیر مین ہوئی اب غور کرنا چاہئے کہ شیخ کے زمانہ سے عمرو لیث کے زمانہ کے درمیان تین صدیان ہین، ان تین صدیون کے درمیان صرف دو پیران کہن سال کا واسطہ پڑتا ہے، یعنی ایک پیر کہن سال وہ ہے جس نے اُس پیر کہن سال کا حال بیان کیا جس نے بہت سے بادشاہون اور ان کی حکومتون کو دیکھا تھا، خاص کر عمرو بن لیث کی تاریخ پر ایک عمر صرف کی تھی، اگرچہ صاف طور پر نہین لکھا ہے، مگر شعر پڑھنے سے

[1] بوستان باب ششم،

متبادر یہی ہوتا ہے کہ عمرو بن لیث کا زمانہ اُس نے دیکھا تھا، اس کے حالات اس کو بہت یاد تھے، اب ان دونون بڈھون کی عمرین قیاس کرو کیا ہونگی، پھر شیخ کی عمر پر غور کرو کہ جس وقت یہ روایت شیخ نے سنی ہوگی شیخ کی کیا عمر ہوگی، اگرچہ شیخ کی عمر کا پتہ تو نہین چلسکتا کس عمر مین انھون نے سنا مگر ان دونون بڈھون کی عمرین یقیناً ایک سو بیس برس سے بہت زیادہ ہوئی ہونگی،

ان حوالون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ کا ایک سو بیس کی عمر پانا محال و ناقابل یقین نہین،

شیخ کے حالات مین دولتشاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ وہ حضرت غوث الاعظم سیدنا عبد القادر جیلانی علیہ الرحمۃ کے مرید تھے، مولانا حالی اس کو غلط سمجھتے ہین، مین مانتا ہون کہ دولتشاہ نے غور و تحقیق کرکے یہ تذکرہ نہیں لکھا ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی گمان نہین کرسکتا کہ دولتشاہ نے قصداً جھوٹ[1] تصنیف کرکے حالات لکھے ہین، اس نے کسی سے سنکر یا کسی تذکرہ مین دیکھکر لکھا ہوگا وہ لکھتا ہے، "در صحبتِ شیخ عبد القادر عزیمت حج نمود و بعد ازان گویند چہار نوبت حج کردہ بیشتر پیادہ و بغزا و جہاد بطرف روم و ہند رفتہ" مولنا حالی کے غلط سمجھنے کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ حضرت کی رحلت ۵۶۱ھ مین ہوئی تھی، اگر حضرت کی ملاقات شیخ کے ساتھ مان لیجائے تو پھر شیخ کی عمر کو ایک سو بیس برس سے بہت زیادہ مان لینا پڑے گا، اس لیے اس بات کا یقین کرکے کہ شیخ کی عمر ایک سو بیس برس سے زیادہ نہین ہوئی تھی، اس واقعہ کا انکار کیا ہے، فی الحقیقۃ اگر شیخ کی عمر ایک سو بیس برس سے زیادہ نہ ثابت ہوسکے تو بیشک اس واقعہ کا انکار درست ہوگا، اور دولتشاہ کی روایت غلط ہوگی مگر تحقیق کرنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاے گی کہ شیخ کی عمر ایک سو بیس برس سے زیادہ تھی، اس کے علاوہ یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ خالق کائنات نے انسان کی عمر کی حد مقرر نہین کی ہے جس طرح اس کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اسی طرح بعض خصائص خاص عطا فرمائے ہین جو دوسرے

[1] معارف:- جھوٹ نہین مگر یہ تو ممکن ہے کہ اس نے قلتِ تحقیق کی بنا پر کسی اور بزرگ کے بجاے شیخ عبد القادر کا نام سہواً لکھ دیا ہو، اور اس قسم کی غلطیان دولتشاہ مین بکثرت ہیں، شیخ عبد القادر گیلانی کا مرید ہونا بھی دولتشاہ نے لکھا ہو جو ممکن ہے کہ گلستان کے غلط قرأت "دیدم" کے قیاس پر اس نے لکھا ہو،

جانداروں کو مُنین دیئے منجملہ ان خصائص کے یہ بھی ہے کہ اس کی عمر کی کوئی حد مقرر نہین کی ہے کوئی کم عمری مین مرتا ہے کوئی بڑی عمر پاتا ہے کوئی اتنی بڑی عمر پاتا ہے کہ دور دور اس کا جواب نہین ملتا[1]،

مین نے گلستان کے جتنے قلمی نسخے دیکھے سوا دو ایک کے سب نسخون مین اس طرح لکھا ہے "عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ دیدم" ایک نسخہ ۱۷۲ھ کا لکھا ہوا ہے اس مین بھی دیدم ہے اس سے قدیم تر نسخون مین بھی یہی لکھا دیکھا، اور مطبوعات مختلفہ مین بھی یہی چھپا دیکھا ہے، مگر ایک نسخہ قدیم تر زمانہ کا ہے جو اصل شیخ کے دست خاص کے قلمی نسخہ کی نقل ہے اس مین "دیدند" لکھا ہے، مین بچپن مین گلستان اپنے استاد مولوی حکیم سید میر لکھنوی مرحوم سے پڑھتا تھا مجھے خوب یاد ہے کہ اس مین بھی "دیدند" لکھا تھا مین نے یہی پڑھا تھا، اس کے علاوہ نسخہ مطبوعہ مطبع نظامی مین بھی "دیدند" لکھا ہے، قدیم مطبوعات مین بھی غالباً "دیدند" چھپا ہے، مگر جتنے قلمی اور مطبوعہ ایرانی خط یا بمبئی کے مطبوعہ نسخے دیکھنے مین آئے سب مین

[1] اگر غور کیا جائے تو بعض باتین کسی شخص خاص یا اس کے خاندان مین ایسی پائی جاتی ہین جو عموماً کسی مین نہین پائی جاتین، مثلاً اپنی چار پشتین دیکھنے والا شخص ڈھونڈنے سے بھی نہین ملتا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ دیکھنے مین آیا ہے کہ کسی نے اپنے پردادا کو دیکھ لیا یا کسی نے اپنے پروتے کو دیکھ لیا، اس کی نظیر بھی مشکل سے ملتی ہے لیکن حال مین ایک شخص لالہ دولت رام کا حال ہندوستانی اخبار مین چھپا ہے اس نے اپنے سگڑ پوتے کو دیکھ لیا ہے، اس اخبار کا ترجمہ مختصر یہ ہے :-

"لالہ دولت رام جی کی عمر ایک سو برس سے بہت زیادہ ہے، ان کو حال مین سگڑ پوتا پیدا ہوا ہے، دولت رام کے بیٹے شیو سرن داس کی عمر ستر برس ہے، ان کے بیٹے نونہال چند کی عمر چوالیس برس کی ہے، ان کے بیٹے ہرکشن چندر کی عمر تیئیس برس کی ہے، اور ہرکشن چندر کے بیٹے کی عمر آٹھ مہینے کی جس کا نام رومیش چندر ہے"

دولت رام بادام حلوا، پراٹھے دو سیر دودھ روز کھاتے ہین، عینک نہین لگاتے، سماعت کی قوت بدستور ہے، دانت ابھی نہین ٹوٹے، دو تین میل تک روزانہ ٹہلتے ہین" (منقول از روزنامہ ہندوستانی لکھنؤ مورخہ ۱۲ تاریخ، ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء)

اسی پر قیاس اگلے زمانے والون کا کرنا چاہئے،

دیدم ہے، مین اس دیدم کی قرأت کو صحیح نہین جانتا مگر یہ نہین خیال کرنا چاہئے کہ مین حضرت شیخ کی ملاقات کی روایت کو غلط سمجھتا ہون، ہان گلستان مین جو حکایت لکھی ہے، اس مین "دیدند" کو صحیح اور "دیدم" کو غلط خیال کرتا ہون، اس موقع پر شیخ کی ملاقات حضرت سے ثابت نہین ہوتی،

علامہ شبلی مرحوم کو ایک سو بیس برس کی عمر خلاف قیاس معلوم ہوئی اس وجہ سے شیخ کی طرف اس غلطی کو منسوب کیا کہ شیخ نے بجائے علاؤ الدین تکش خوارزم شاہ، محمود خوارزم شاہ کا نام لکھا ہے، حالانکہ محمود شاہ خوارزم کا نام ہی لکھنا شیخ کا (بشرطیکہ اس نام کا بادشاہ خوارزم شاہیہ بادشاہون مین گذرا ہو) اس بات کی دلیل ہے کہ شیخ کی عمر زیادہ ہوئی تھی کیونکہ کوئی صادق القول شخص اقرار کرے کہ مین نے فلان بادشاہ کا زمانہ پایا، اس کو دیکھا اور کوئی محال عقلی درمیان نہ ہو تو اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہین، اس کو ماننا ہی پڑے گا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نام کا کوئی بادشاہ خوارزم شاہیون مین نہین معلوم ہوتا ہے، تاریخ گزیدہ مین کسی خوارزم شاہی بادشاہ کا نام محمود شاہ خوارزم نہین لکھا ہے، اس تاریخ کا مصنف خوارزم شاہیون کے قریب العہد زمانہ مین گذرا ہے، اگر کوئی بادشاہ اس نام کا ہوتا تو ضرور لکھتا[1]،

میری تحقیق مین یہ بادشاہ محمد بن تکش خوارزم شاہ ہے، شیخ نے بھی گلستان مین محمد خوارزم شاہ لکھا ہے یہ وہی بادشاہ ہے جس نے ۶۱۴ھ مین ناصر خلیفہ بغداد پر چڑھائی کی تھی[2] اس کا ارادہ تھا کہ عباسی خاندان کے عوض

[1] نوشتگین ملک شاہ از سنہ احدے وتسعین واربع مائۃ ۴۹۱ تا شوال سنہ ثمان عشرین وست مائۃ ۶۲۸ صد وسی وہشت سال اولیں نوشتگین غرجہ است در زمان برکیارق (نام بادشاہ سلجوقی) وفات کرد پسرش محمد بن نوشتگین باشارت سنجر بن ملک شاہ حاکم و والی خوارزم گشت بخوارزم شاہ منسوب شد و قطب الدین لقب یافت در سنہ احدے وعشرین وخمس مائۃ درگذشت سلطان اتسز بن محمد نوشتگین در تاسع جمادی الاخری سنہ احدے وخمسین وخمس مائۃ درگذشت، خوارزم شاہ الپ ارسلان بن اتسز در تاسع رجب سنہ ثمان وخمسین وخمس مائۃ نماند خوارزم شاہ سلطان شاہ بن الپ ارسلان در تاسع عشر رمضان سنہ تسعین خمس مائۃ نماند سلطان قطب الدین محمد تکش خان بن الپ ارسلان بن اتسز در سبع عشر وست مائۃ درگذشت رکن الدین غور سانجی در تسع عشر وست مائۃ شہید گردید، غیاث الدین پیر شاہ وفات او در سبع وعشرین وست مائۃ بود، سلطان جلال الدین منگبرنی بن محمد بن تکش خان در ثمان وعشرین وست مائۃ کشتہ شد وملک بخول انتقال (ملخصاً از تاریخ گزیدہ مطبوعہ یورپ چاپ عکس)

[2] روضۃ الصفا مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ ۷۰۲، ذکر ناصر خلیفہ،

ایک سید عالی خاندان علاء الملک ترمذی کو خلیفہ بنائے، مگر رستہ میں اس قدر برف پڑی کہ لشکر کو سخت نقصان پہنچا، اس کو واپس ہونا پڑا، اس کے تھوڑے زمانہ کے بعد فتنۂ تاتار کا آغاز ہوا، شیخ گلستان میں یون فرماتے ہین:

"درسالے کہ سلطان محمد خوارزم شاہ با خطا برائے مصلحتے صلح اختیار کرد بجامع کاشغر در آمدم پسرے دیدم" الخ

اب دیکھنا چاہئے کہ یہ صلح کس سنہ مین ہوئی، اس صلح کا ذکر تاریخ جہانکشائے جوینی مین اس طرح لکھا ہے:-

"در اثنائے آں خبر رسید کہ لشکر ختائے بدر سمرقند آمدست، و سمرقند را حصار دادہ اند، سلطان (محمد خوارزم شاہ) ہم از جند بدان طرف متوجہ شد و بجانب ملک رسولان فرستاد و تمامت لشکرہا راکہ در اطراف داشت باز خواند و از ممالک حشر خواست و متوجہ سمرقند شد و لشکر ختائے مدتہا بر در سمرقند بر آب رودخانہ لشکرگاہ ساختہ بودند و ہفتاد نوبت جنگ کردہ بیرون یک نوبت کہ غالب گشتہ بودند و لشکر سمرقند را در شہر راندہ مقہور بودہ اند و لشکر اسلام منصور چوں لشکر خطاے دیدہ اند کہ از محاربت ایشان جز باد بدست ندارند و بر خاک سیاہ خواہند نشست و آبے کہ افتادست باز بآں بر نخواہد آمد و از جانب سلطان آوازہ توجہ و از جانب دیگر استیلائے کوچلک خاں رسید براسم نہادنہ مراجعت کردند (تاریخ جہانکشائے جوینی مطبوعہ بریل لیڈن صفحہ ۸۰ جلد ثانی)

جہانکشا کے مصنف علاؤالدین عطا ملک جوینی نے جو شیخ سعدی کے ممدوح بھی ہین، اپنی کتاب مین اکثر مواقع پر سنہ نہین لکھا ہے، نہین معلوم ہو سکتا کہ کس سنہ مین صلح وقوع مین آئی مگر قیاس یہ ہے کہ یہ مصالحت ۶۰۴ھ اور ۶۰۷ھ کے درمیان کسی سال واقع ہوئی ہوگی، کیونکہ ۶۰۴ھ کے پہلے خوارزم شاہ نے گورخان کے ایلچی کو اس کی گستاخی پر قتل کر دیا تھا، بنائے مخاصمت خان خطا گورخان سے یہی ہوئی تھی،[1] اس واقعہ کے بعد لڑائی اور صلح ہوئی ہوگی، غالباً یہ صلح ۶۰۷ھ یا ۶۰۸ھ مین ہوئی تو شیخ کا ورود کاشغر مین اسی سال مین ہوا ہوگا، اگر شیخ کی

[1] کیونکہ ایلچی کے قتل سے پہلے گورخان سے دوستی تھی خوارزم شاہ خراج بھی گورخان کو دیتا تھا، اس لیے یہ جنگ ۶۰۶ھ مین یا ۶۰۷ھ مین ہوئی ہوگی، علامہ مرزا محمد قزوینی نے یہی سنہ لکھا ہے، دیکھو (حاشیہ تاریخ جہانکشائے جوینی جلد ثانی صفحہ ۸۰ مطبوعہ یورپ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۰ پر)

عمر ایک سو بیس برس یقین کر لیجائے تو اس وقت شیخ کی عمر چھبیس ستائیس سال ہوگی، مگر میرا قیاس ہے کہ اس سے زیادہ عمر ہوگی،

کسی صاحبِ کمال کا عہدِ شباب مین شہرت پذیر ہونا چندان حیرت کی بات نہین اس کی نظیر کتب تاریخ مین ملے گی، مگر شیخ کی عظمت اور شاعری کی شہرت ان کے زمانہ مین ایسی عالمگیر ہوئی کہ ایشیا کا وہ حصہ جہان کی زبان فارسی نہین تھی وہان بھی شیخ کی ذات آفتاب کی طرح مشہور تھی کہ مدرسہ کے لڑکے بچے ان سے واقف تھے، البتہ یہ سخت تعجب کی بات ہے کہان شیراز کہان کاشغر، اس حکایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کا مذاق علمی کتنا بلند تھا کہ علم ادب و شاعری کا ذوق ہر طالب العلم کے رگ و پے مین سرایت کر گیا تھا، درحقیقت اس وقت کے مسلمانون کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ ملک پر قبضہ کافرون بت پرستون کا تھا طرح طرح کی مصیبتون کے ساتھ آئے دن تبدیل حکومت ہوتی رہتی تھی جس سے امن و امان جو ذریعۂ اطمینان و ترقی کا ہے وہ مفقود تھا پھر بھی مسلمان اپنی مذہبی زبان کی حفاظت اپنی جان و مال سے بڑھکر کرتے رہتے تھے، اسی وجہ سے ان کا تمدن و مذہب قائم رہا، اور نہ صرف قائم رہا بلکہ کافرون بت پرستون نے اُن کا مذہب و تمدن اختیار کیا، اور اسلام اور مسلمانون کی ترقی کے خواہان رہے،

صلح خطائے و خوارزم شاہ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ شیخ کا اس زمانہ مین کاشغر مین پہنچنا مسلم ہے میرے نزدیک یہ واقعہ ۶۰۷ھ یا ۶۰۸ھ مین تسلیم کیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ شیخ کی شاعری کی شہرت اور عظمت اس زمانہ مین ہو چکی تھی، جس زمانہ مین سعد بن ابوبکر پیدا بھی نہین ہوا تھا، بلکہ اتابک ابوبکر عالم طفلی و شاہزادگی مین تھا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ قبل) معارف :- شاہ خطا اور سلطان محمد خوارزم شاہ مین کئی لڑائیان ہوئین جنمین ایک لڑائی ۶۰۴ھ مین ہوئی (جہانکشا جوینی جلد دوم ص ۸۰) اس مین سلطان کی فتح ہوئی، دوبارہ کچھ دنون کے بعد سمرقند کے باہر پھر طرفین کا مقابلہ ہوا، جو صلح مذکور پر ختم ہوئی (جوینی ج ۲ ص ۸۰) اور ۶۱۲ھ مین خوارزم شاہ کو خطا پر کلی فتح حاصل ہوئی (ابن اثیر ۶۱۲ھ) اسلیے یہ صلح ۶۰۴ھ کے بعد اور ۶۱۲ھ سے پہلے ہوئی، یہ واقعات طبقات ناصری منہاج سراج ص ۳۲۹ مین بھی مذکور ہین، مگر سنہ کا ذکر نہین،

ایسی حالت مین شیخ کا تخلص شاہزادہ سعد بن ابوبکر کے نام پر رکھنا بالکل محال ہے، غالباً شیخ نے اسی صلح کے متعلق اس شعر مین اشارہ کیا ہے،

صلح ست میانِ کفر و اسلام   با ما تو ہنوز در نبردی

دوسرا واقعہ جس سے شیخ کی عمر کا اندازہ ہوگا وہ علامہ ابوالفرج ابن جوزی کا تلمذ ہے، علامہ ابن جوزی نے ۵۹۷ھ مین انتقال کیا تھا ظاہر ہے کہ اُن کی وفات سے بہت پہلے ان سے شرفِ تلمذ شیخ کو حاصل ہوا شیخ نے اپنا واقعہ گلستان مین اس طرح پر تحریر فرمایا ہے:-

"چندانکہ مرا شیخ اجل ابوالفرج ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ ترک سماع فرمودے و بخلوت و عزلت اشارت کردے بعنفوان شبابم غالب آمدے و ہوا و ہوس طالب ناچار بخلاف رائے مربی قدمے چند برفتے و از سماع و مخالطت حظے برگرفتمے و چون نصیحت شیخم یاد آمدے گفتمے،

قاضی گر با ما نشیند بر فشاند دست را   محتسب گر مے خورد معذور دارد مست را

تا شبے بمجمع قومے برسیدم و در ان میان مطربے دیدم . . . ."

پھر آگے چل کر قوال کی بدآوازی کی مذمت کی ہے، پھر فرماتے مین:-

بامدادان بحکم تبرک دستار از سر و دینار از کمر بکشادم و پیش مغنی بنہادم و در کنار گرفتم و بسے شکر گفتم یاران ارادت من در حق وے بخلافِ عادت دیدند و بر خفتِ عقلم نہفتہ بخندیدند یکے از ان میان زبانِ تعرض دراز کرد و ملامت کردن آغاز کہ این حرکت مناسب رائے خردمندان نکردی کہ خرقہ مشائخ بچنین مطربے دادن کہ ہمہ عمرش درمے در کف نبودہ است و قراضہ در دف . . .

. . . . . . گفتم زبان تعرض مصلحت آن است کہ کوتاہ کنی بحکم آنکہ مرا کرامت این شخص ظاہر شد گفت بر کیفیت آن واقف گردان تا ہمچنین تقرب نمایم و بر خطائیست کہ کردم استغفار کنم گفتم بعلت آن کہ شیخ اجلم بارہا بترک سماع فرمودہ است و موعظہائے بلیغ گفتہ و در سمع قبول من

نیامدہ تا امشب کہ مرا طالع میمون و بخت ہمایون بدین بقعہ رہبری کرد و بدست این مغنی توبہ کردم کہ بقیت زندگانی گرد سماع و مخالطت نگردم،

یہ حکایت شیخ نے اپنے ایام جوانی کی بیان کی ہے جب پر ساٹھ ستر برس کا زمانہ گذر چکا تھا[1] اس حکایت کے ہر جملہ پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ شیخ پر علامہ ابن جوزی کی خاص نظرِ شفقت و مہربانی تھی جس طرح شفیق اور مدبر استاد طلبہ کی جماعت مین سے جن طالب العلمون کو لائق و صاحب مذاقِ سلیم جانتا ہے ان پر توجہ زیادہ کرتا ہے، روک ٹوک سے اُن کے اخلاق کو درست کرتا رہتا ہے یہی معاملہ علامہ ابن جوزی کا شیخ کے ساتھ تھا، یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ اس واقعہ سماع کے وقت شیخ کا زمانہ طالب العلمی کی حد سے گذر چکا تھا، ان کا شمار طبقہ مشائخ مین ہو چکا تھا جبھی ان کے دوستون نے خرقہ دینے پر اعتراض کیا یہ دستور مشائخ کا ہے کہ جب قوال کی قوالی سے محظوظ ہوتے ہین اور وہ وقت سماع کا خوش گذرتا ہے تو صاحبِ وجد و حال اپنا لباس قوال کے نذر کرتا ہے کہ اس کی بدولت وقت خوش گذرا اور فیضِ روحانی بوسیلۂ قوال حاصل ہوا،

شیخ نے اپنی دستار دوسرے خیال سے قوال کو عنایت فرمائی کہ ایسے مربی استاد کی نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا، مگر قوال کی بدآوازی کی بدولت سماع سے توبہ کرنی پڑی، اور اُس کا شکریہ ادا کرنا پڑا، اس حکایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شیخ اور علامہ کے درمیان زمانۂ دراز تک رابطۂ صحبت و نصیحت کا قائم رہا ہوگا، ممکن ہے کہ یہ واقعہ علامۂ موصوف کی زندگی مین شیخ کے ساتھ گذرا ہو، جملہ "بارہا فرمودہ است" ہمارے اس خیال کی تائید کرتا ہے

شیخ کی عمر ایک سو بیس برس اسی وجہ سے بعض محققین نے قبول کرلی ہے کہ علامہ ابن جوزی کی شاگردی بغیر اس حد تک ان کی عمر قبول کئے درست نہین مانی جاسکتی، مگر ایک دِقت یہ ہے کہ شیخ کی عمر علامہ ابن جوزی کے سالِ وفات تک جو ۵۹۷ھ ہے ۲۶ برس کی ٹھہرتی ہے، اور یہ عمر تعلیم و تربیت و اخذ فیض صحبت کے لئے کافی سمجھی جاسکتی ہے، لیکن یہ ماننا ذرا مشکل ہے کہ علامۂ ابن جوزی کی وفات کے دس برس بعد وہ کاشغر مین جاتے ہیں

[1] گلستان ۶۵۶ھ مین تمام ہوئی،

اور وہان اپنی شہرت وعظمت بچہ بچہ کے دل مین پاتے ہین، اتنی قلیل مدت مین اتنی شہرت دور دور ملکون مین کیونکر

ہو سکتی ہے، لامحالہ اُن کی عمر علامہ ابن جوزی کی وفات کے وقت ۵۹۷ھ مین ۲۶ برس سے زیادہ ہوگی،

اب شیخ کا ایک اور واقعہ جو نہایت اہم ہے خود شیخ کی زبان سے لکھتا ہون جس سے ظاہر ہوگا کہ شیخ صلیبی لڑائیون

کے زمانہ مین عیسائیوں کی قید مین پڑ گئے تھے، حلب کے ایک رئیس نے ان کو پہچانا، کچھ فدیہ دیکر ان کو قید فرنگ سے

نجات دلائی، گلستان مین تحریر فرماتے ہین:-

"از صحبت یاران دمشقم ملالتے پدید آمدہ بود، سر در بیابان قدس نہادم، و با حیوانات انس گرفتم،

تا وقتیکہ اسیر قید فرنگ شدم، در خندق طرابلس مرا با جہودان بکار گل داشتند یکے از رؤسائے

حلب مرا کہ با او سابقہ معرفتے بود گزر کرد و بشناخت، گفت ایں چہ حالت است کہ موجب ملامت

ست گفتم چہ گویم

ہمی گریختم از مردماں بکوہ و بدشت کہ از خدائے نبودم بدیگرے پرداخت

قیاس کن کہ چہ عالم بود دریں ساعت کہ در طویلۂ نامردمم بباید ساخت

بر حالت من رحمت آورد و بدہ دینار از قید فرنگم باز خرید و با خویشتن بحلب برد"

شیخ نے جس زمانہ مین شہر دمشق چھوڑ کر بیابان مین رہنا شروع کیا تھا غالباً یہ وہی زمانہ ہوگا، جب کہ

مسلمانون اور عیسائیون مین جنگ جاری تھی، طرفین کے آدمی اگر مخالف فریق کے نظر پڑ جاتے ہون گے

تو وہ ان کو قید کر لیتا ہوگا، اسی وجہ سے شیخ نے آبادی چھوڑ کر بیابان مین رہنا پسند کیا، مگر اس سے بدتر حالت ہو گئی

کہ دشمن کی قید مین پڑ گئے، شیخ کو جو روحانی تکلیف اس قید فرنگ سے پہنچتی تھی وہ قطعۂ مذکور سے ظاہر ہے، صلیبی

عیسائیون کے ظلم وستم سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہین، خود عیسائی مورخین ان عیسائی جنگجویون کی سخت مذمت

کرتے ہین، ڈاکٹر لیبان مشہور مستشرق فرانسیسی نے اپنی بے نظیر کتاب تاریخ تمدن عرب[1] مین جہان صلیبی عیسائیون

کی شقاوت اور بد افعالی کا حال لکھا ہے وہان پر لکھتے ہین کہ شیخ سعدی نے انھین کی نسبت کہا ہے، اگر انھین آدمی

[1] تمدن عرب ص ۲۹۸،

کہنا انسانیت کے لیے عار ہے،" الغرض جنگ صلیبی کے مشہور فاتح سلطان صلاح الدین جب بیت المقدس کو

بتاریخ ۲۷ رجب ۵۸۳ھ فتح کرنے کے بعد دوسرے شہرون کو فتح کرتا رہا اور عیسائیون کے پاس صرف سواحل

اور شام کا کچھ حصہ رہ گیا تھا، تو عیسائیون نے صلح کر لی، صلح کے بعد فریقین کے لوگ ایک دوسرے فریق کے

ملک مین آمد و رفت کرنے لگے، اور دونون فریق (یعنی عیسائیوں اور مسلمانون کے) شہر امن وسلامتی مین آ یک

سمجھے جانے لگے تو پھر یہ مصیبت جاتی رہی، یہ صلح بدھ کے دن ۲۲ شعبان ۵۸۸ھ مین ہوئی، قاضی ابن خلکان

جو شیخ سعدی کے معاصر لیکن عمر مین شیخ سے بہت چھوٹے ہین، اپنی مشہور تاریخ مین لکھتے ہین[1]:-

"حاصل یہ کہ دونون کے درمیان صلح ہو گئی، اور اس صلح کا اتمام ۲۲ شعبان ۵۸۸ھ کو ہوا، اور

منادی نے اس کا اعلان کیا کہ اب اسلامی اور عیسائی ملک امن اور صلح مین برابر ہین تو جس فریق

کا جو آدمی چاہے دوسرے فریق کے ملک مین بے خوف وخطر جا سکتا ہے، یہ دن خاص حیثیت کا

تھا جس مین فریقین کو وہ خوشی ہوئی جس کا اندازہ اللہ تعالیٰ فرما سکتا ہے؛

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد یقین ہوتا ہے کہ شیخ کو یہ مصیبت ۲۲ شعبان ۵۸۸ھ سے پہلے جنگ کے زمانہ

مین پیش آئی ہوگی،

اس واقعہ کو جس طرح مین نے لکھا ہے اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ شیخ کی ولادت ۵۷۱ھ اور ان کی عمر

بقول اکثر محققین ایک سو بیس برس باور کرنے پر شیخ کی عمر صلح کے زمانہ مین (۵۸۸ھ) سولہ سترہ برس کی ٹھہرتی ہے جو

مستبعد و خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے، میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے مولانا حالی مرحوم نے اس[2] واقعہ کو ساتوین صدی

ہجری اور بارہوین صدی عیسوی کے وسط مین قبول کیا ہے، مین کہتا ہون کہ اس وقت سات سو برس پہلے کے

واقعات کو اس طرح پر فیصل کرنا جس طرح آجکل کے واقعات یا آج سے سو پچاس برس پہلے کے واقعات کو فیصل کرتے

ہیں، محال ہے، اس لیے بہ یقین نہین کہہ سکتے کہ یہ واقعہ چھٹی صدی کے اخیر زمانہ کا ہے یا ساتوین صدی کے آغاز کا

[1] تاریخ ابن خلکان مطبوعہ مصر صفحہ ۴۰۰، [2] حیات سعدی مطبوعہ دہلی صفحہ ۳۵،

لیکن میرے قیاس کے قرائن یہ ہین کہ شیخ نے دمشق کے دوستون سے رنجیدہ ہو کر بیابان مین رہنا شروع کیا اگر دوسری جگہ امن کی ہوتی تو وہان چلے جاتے، مگر جنگ کی وجہ سے کوئی امن کی صورت کسی شہر و قریہ مین نظر نہین آتی ہوگی، ناچار بیابان مین رہنا شروع کیا، مگر وہان بھی امن نہ ملا پکڑے گئے، اگر ساتوین صدی مین یہ واقعہ سمجھا جائے تو اس زمانہ مین بیت المقدس پر مسلمانون کا قبضہ برسون سے ہو چکا تھا، مسلمانون کی دھاک بیٹھ چکی تھی، اکثر شہرون پر قابض ہو چکے تھے، صرف بلادِ ساحلیہ[1] پر عیسائیون کا قبضہ رہگیا تھا، صلح و امن و امان ہونے کی وجہ سے آمد و رفت دونون قومون مین رہتی تھی، ایسے زمانہ مین شیخ پر قید کی مصیبت کا واقعہ بنہایت مستبعد معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بیت المقدس اور اس کے اردگرد بلاد و قریات سب مسلمانون کے قبضہ مین آچکے تھے، قدس سے طرابلس بہت دور واقع ہے، ان سب حالات پر غور کرکے یہ یقین ہوتا ہے کہ قیدِ فرنگ کا واقعہ چھٹی صدی کے اخیر مین ہوا جیسا کہ اوپر لکھا گیا، اسی ایک واقعہ سے یقین کرنا پڑے گا کہ شیخ کی عمر ایک سو بیس برس سے زیادہ ہوگی،

اتابکانِ[2] فارس کی سلطنت سنہ ۵۴۳ھ سے سنہ ۶۸۶ھ تک رہی، اس مدت مین اخیر بیس سال یعنی سنہ ۶۶۴ھ کے

[1] سلطان صلاح الدین نے طرابلس کا محاصرہ کیا، لیکن بیت المقدس کیطرح اسکو فتح نہ کرسکا صلح کرلی، پھر ایک صدی کے قریب عیسائی قابض رہے، ملک قلاؤن نے پھر بزور وقوت قبضہ کرلیا، (دیکھو دائرۃ المعارف علامہ بطرس لبستانی مطبوعہ مصر)

[2] اتابکان اول بادشاہ اتابک سنقر بن مودود در سنہ ست و خمسین و خمس مائۃ درگذشت اتابک زنگی بن مودود در سنہ ستین درگذشت، اتابک تکلہ بن زنگی بن مودود در سنہ تسعین و خمسین مائۃ درگذشت اتابک طغرل بن سنقر بن مودود در تسع و تسعین و خمس مائۃ بردست سعد بن زنگی گرفتار شد، اتابک سعد بن زنگی بن مودود در ثمان و عشرین و ست مائۃ درگذشت، اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی در ثمان و خمسین و ست مائۃ درگذشت، اتابک سعد بن ابوبکر بعد از پدر بدوازدہ روز درگذشت، اتابک محمد بن سعد در سنہ ستین و ست مائۃ درگذشت، اتابک محمد شاہ بن سلغرشاہ در احدی و ستین و ست مائۃ درگذشت، اتابک سلجوق شاہ بعد از سنہ ثلث و ستین و ست مائۃ در دست مغول گرفتار شدہ کشتہ گشت، اتابک ابش خاتون بنت سعد بن ابوبکر بن سعد بن زنگی بن مودود یک سال حکم کرد و بعد از ان فارس در تصرف مغول در آمد (حکومت بنام او در ابش خاتون) بود پس از ان نام سلغریان از جہان برافتاد، فقط

(ماخوذ از تاریخ گزیدہ مطبوعہ یورپ)

بعد دیوان مغول کا تصرف رہا، مگر نام ابش خاتون بنت سعد بن ابوبکر بن سعد زنگی کا تھا، ان بادشاہون مین تین بادشاہون کی مدتِ سلطنت دراز ہوئی، وہ تین بادشاہ یہ تھے، تکلہ[1]، سعد زنگی[2] اور ابوبکر[3] بن سعد سب سے کم سلطنت شاہزادہ سعد بن ابوبکر کی رہی، صرف بارہ[4] دن، بعض نے شیخ کی ولادت تکلہ کے زمانہ مین لکھی ہے، مگر یہ غلط ہے، تکلہ سنہ ۵۷۱ھ مین تخت پر بیٹھا، اور سنہ ۵۹۰ھ مین مرا ہے، اس کے زمانہ مین اگر ولادت شیخ کی ہوتی تو ہرگز وہ جنگ صلیبی کے زمانہ مین دمشق مین موجود نہین ہو سکتے تھے، ہان اگر تکلہ کے آغاز سلطنت کے زمانہ سنہ ۵۷۱ھ مین شیخ کی ولادت مان لیجائے تو سنہ ۵۸۸ھ صلح کے سال مین ۱۷ برس کی ٹھہرتی ہے، اور عمر ایک سو تیس برس کی یقین کیجائے گی، اور ابن جوزی کے سال وفات سنہ ۵۹۷ھ مین اُن کی عمر چھبیس برس کی تسلیم کیجائے گی، اس طرح پر ایک سو تیس برس شیخ کی عمر مان لینے مین سب دقتین جاتی رہتی ہین، اور سب واقعات کی کڑیان مل جاتی ہین، مگر یہ عمر مان لینے پر حضرت غوث الاعظم کی ملاقات جس کے راوی صرف دولتشاہ سمرقندی ہین ثابت نہین ہو سکتی، مجھکو تو ان کی عمر ایک سو چالیس بلکہ پچاس ساٹھ برس تک تسلیم کرلینے مین بھی کچھ تامل نہین ہے جب کہ اس عمر کے آدمی ہر زمانہ مین ڈھونڈنے سے مل سکتے ہین، اور کتبِ تاریخ مین متعدد مثالین مل سکتی ہین، مگر مجھکو شک ہے کہ ناظرین معارف شیخ کی درازی عمر کی نسبت اس قدر حسن ظن ظاہر کرسکتے ہین، بہرحال اتنا تو ضرور قبول اور یقین کرینگے کہ شیخ اپنا تخلص ہرگز شاہزادہ سعد بن ابوبکر کے نام پر نہین رکھ سکتے تھے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک طویل العمر شخص اپنے تخلص کی بنیاد ایک ایسے شاہزادہ کے نام پر قائم کرے جو اس کے پوتے پر پوتے سے بھی چھوٹی عمر کا ہو اس کی شاعری اس زمانہ مین شہرۂ آفاق ہو جب کہ شاہزادہ کتم عدم سے عالم وجود مین بھی نہ آیا ہو، بلکہ شاہزادہ کا باپ ابوبکر بھی عالم طفلی مین ہو، یا وہ بھی پردۂ عدم مین ہو، ہان ابوبکر کے باپ سعد زنگی کے نام سے (جو شاہزادہ سعد کا دادا تھا) تخلص ماخوذ کہا جائے تو ممکن ہے، اسی بنا پر دولت شاہ سمرقندی کا بیان تمامتر صحیح ہے، علامہ عبد الوہاب قزوینی کا تاریخ گزیدہ کے حوالہ سے یہ لکھنا کہ "تخلص سعدی نیز از نام ہمین شاہزادہ ماخوذ است" بالکل قیاسی بات ہے، صاحب تاریخ گزیدہ نے کہین اپنی تاریخ مین یہ نہین لکھا ہے کہ تخلص سعدی نیز از نام ہمین شاہزادہ ماخوذ است

تاریخ گزیدہ مطبوعۂ یورپ چاپ عکس اس وقت میرے پیشِ نظر ہے، اس مین اسی قدر لکھا ہے،

"وھو مشرف الدین مصلح الشیرازی و باتابک سعد بن ابی بکر سعد بن زنگی منسوب است، بشیراز

در سابع عشر ذی الحجہ سنہ تسعین وست مأتہ درگذشت، مردے صاحب وقت بود نظم و نثر خوب دارد، و

شہرتے تمام، شیوہ غزل بر او تمام شد،"

"منسوب" سے مراد یہ ہے کہ شاہزادہ سعد کی سرکار سے ان کو تعلق ہوگا یا کچھ وظیفہ[1] ملتا ہو، اس سے یہ ہرگز مراد نہین کہ ان کا تخلص شاہزادہ کے نام سے ہو، کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک شاعر تو عمر بھر شعر کہتا رہا ہو، اس کی شہرت دنیا مین اچھی طرح پھیل چکی ہو، مگر اس نے کوئی تخلص اپنا نہین رکھا ہو، اخیر عمر مین اگر ایک نوجوان شہزادہ کے نام سے اپنا تخلص بنائے یہ ناممکن ہے، شاعر جب شعر کہنے لگتا ہے اسی وقت اپنا کوئی تخلص بھی رکھ لیتا ہے، ہان ایسا ہوا ہے کہ بعض شعراء نے تخلص پیچھے بدل دیا ہے تو جو تخلص پہلا تھا، اس کو سابق غزلون بھی اسی طرح رہنے دیا ہے، اساتذہ کے کلام مین دونون تخلص والے اشعار موجود ہین،

عبد الوہاب قزوینی صاحبِ مقدمہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ شمس قیس نے کوئی شعر شیخ کا اپنی کتاب المعجم مین نہین لکھا، دوسرے معاصرین کا شعر لکھا ہے، "اوّل تو کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی (جو خلاق المعانی کے لقب سے مشہور ہے) کے صرف ایک دو شعر لکھے ہین، البتہ اُن کے والد کا ایک مسمط جو نعت مین بے مثل ہے پورا نقل کیا ہے" شیخ کے کلام کو استشہاداً نہین لکھنے کی یہ وجہ ہوگی کہ شیخ اس زمانہ مین شیراز سے باہر ہے، اس کو صاحبِ مقدمہ نے بھی قبول کیا ہے، لیکن دوسری وجہ یہ ہے کہ بوجہ معاصرت کے بھی ایک دوسرے کی قدر نہین کرتے، رشک کی یہ کیفیت بڑے بڑے اکابر مین نمایان ہوتی تھی، اور اب بھی ہے، شاعرون کو کون پوچھتا ہے، صاحبِ کتاب المعجم نے بھی بہت ہی کم معاصرین کا کوئی شعر لکھا ہے، جمال الدین عبد الرزاق اصفہانی کا مسمط اس وجہ سے نقل کیا ہوگا کہ وہ کتاب کی تحریر

[1] معارف: منسوب ہونے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہین کہ شیخ کی دونون کتابین گلستان اور بوستان اسی سعد بن ابی بکر بن سعد کے نام سے لکھی گئی ہین، اور بحالت شہزادگی انکے نام سے موسوم کی گئی ہین، جیسا کہ گلستان کے دیباچہ مین مذکور ہے،

کے وقت عالم حیات مین نہ ہونگے، شاعرون کے رشک کا تو یہ حال ہے کہ شیخ کی شاعری اور اس کی قبولیت بمثیل ہونے پر بھی اس وقت کے بعض شاعرون نے مجد ہمگر سے پوچھا کہ سعدی و امامی مین کون بڑا شاعر ہے، مجد ہمگر نے کہا،

اگرچہ بنطق طوطی خوش نفسیم   بر شکر گفتہ ہائے سعدی مگسیم

لیکن در شاعری باجماع امم   ہرگز من و سعدی با امامی نرسیم

شیخ نے اس فیصلہ کو سنکر فرمایا،

ہمگر کہ بعمر خود نہ کرد ست نماز   شک نیست کہ ہرگز با امامی نرسد

پست مذاقی کی حد ہوگئی کہ شیخ کے کلام کا مقابلہ امامی سے کیا جائے جن کو آج کوئی جانتا بھی نہین، وہ تو اپنے وقت مین بھی غیر مشہور تھے، شیخ سے ان کو کیا نسبت، مگر اس پست مذاقی اور تعصب کا باعث وہی معاصرت و ہمزمانی تھی کہ ایک دوسرے کی لیاقت کا اندازہ نہین کر سکتے تھے، یا کرتے تھے تو زبان سے اس کا اعتراف نہین کرتے تھے، ہمگر کے سوا ہمام تبریزی[1] جو ہمگر کی طرح شیخ کے معاصر تھے اور بڑے شاعر تھے ان کو بھی اسکا رشک تھا، کہتے ہین،

ہمام را سخنے دلفریب و شیرین است   ولے چہ سود کہ بیچارہ نیست شیرازی

ان کو بعض اساتذہ نے شیخ کا ہم پلہ قرار دیا ہے، مگر آخر کار شیخ کو ترجیح دینا پڑی، الغرض معاصرت کی وجہ سے بھی شیخ کا کلام ممکن ہے کہ کتاب المعجم مین نہ لکھا گیا ہو، ورنہ عقل اس کو باور نہین کرتی کہ شیخ کا شہرہ تمام دنیا مین ہو اور شیراز مین ان کو کم لوگ جانتے ہون جس کی وجہ سے صاحب المعجم کو اُن کی شاعری و کمال کا علم نہین ہوا،

[1] ہمام تبریزی شیخ کے معاصر تھے، تذکرون سے معلوم ہوتا ہے کہ ملاقات دونوں میں ہوتی تھی، یہ بڑے شاعر اور دولتمند بھی تھے، روسائے تبریز سے تھے، ان کے اشعار دلآویز و شور انگیز ہوتے ہیں، مگر انصاف یہ ہے کہ شیخ کو نہیں پہنچتے، اوپر کا اخیر شعر لکھ چکا ہون پوری غزل ناظرین کی دلچسپی کے لیے یہان پر لکھی جاتی ہے،

بیک کرشمہ توانی کہ کار ما سازی   ولے بچارۂ بیچارگان نپردازی
در آرزوے خیالت غلام خوابم من   خنک کسے کہ تواش ہمنشین و ہمرازی
چرا بدیدن رویت نزود خرسندیم   نسیم با سر زلفت چرا کند بازی
مکن تفرج سرو سہی ہمان بہتر   کہ عشق با قد و بالای خویشتن بازی
بگل بگو کہ زروئیم تجمل نمیگردی   کہ در میان ریاحین بحُسن می نازی
پیام دہ سوے بلبل کہ با وجود ہمام   رہا بود کہ نواہاے عشق پردازی
ہمام را سخنے دلفریب شیرین ست   ولے چہ سود کہ بیچارہ نیست شیرازی

شعلۂ طور

(۲)

از مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی، رفیق دار المصنفین

گدازِ عشق سوز و گداز تغزل کی روح ہے، اسی سے تغزل کے جسم مین جان پڑتی ہے، گدازِ عشق سے خالی تغزل ایک شراب بے کیف ہے اسلئے کہ تغزل نام ہے حسن و عشق کی واردات کی مصوری کا، اور سوز و گداز ہی عشق مین جلا دیتا ہے، اور اسی برق خرمن سوز سے تخلِ عاشقی ہرا ہوتا ہے، گدازِ عشق کا بیان فانی کا خاص حصہ ہے، لیکن جگر نے بھی ایک درد آشنا دل پایا ہے، اسلئے انکے اشعار بھی اس برقِ خرمن سوز کی شرر باریون سے خالی نہین ہین، اور کبھی کبھی انکے ٹوٹے ہوئے دل سے بھی آہ و سوزان نکل جاتی ہے، ہوس پیشہ عشاق کیلئے دردِ عاشقی ایک مصیبت ہے، لیکن جگر کا درد پسند دل اسی لذت یاب ہوتا ہے، اور کمال لذت کے لیے سراپا درد بنجانا چاہتا ہے،

ایکِ کیفِ ناتمام درد کی لذت ہی کیا　　درد کی لذت سراپا درد بنجانے مین ہے

اس کی محرومیون کی یہ انتہا ہے کہ سکون کیا اضطراب بھی یسر نہ ہوا،

جہانِ شوق کی محرومیان نہ پوچھ جگر　　سکون تو کیا کہ میسر نہ اضطراب ہوا

دل کی بربادی،

اس ایک دل کی حقیقت کا آہ کیا کہنا　　جو لاکھ بار بنا اور پھر خراب ہوا

درد و غم کی وسعت اور پہنائی،

اللہ اللہ ترے غم کی وسعتین　　کوئی عالم درد سے خالی نہین

بھری ہوئی ہین فضا مین جمالِ غم تمام　　گناہگار نظر لذتِ عذاب اٹھا

اس کا درد آشنا دل عیشِ وصال کو بھی شباہتِ غم کی وجہ سے قبول کرتا ہے،

کرلیا دل نے عیشِ وصل قبول　　پاگیا کچھ شباہتِ غم کیا

غم حسن کی ایک امانت ہے اور حقِ امانت اسکی غمخواری ہے، اس لیے وہ عام عشاق کے برعکس شبِ ہجر کی درازی کی دعا مانگتا ہے،

تری امانتِ غم کا تو حق ادا کرلون　　خدا کرے شبِ فرقت ابھی دراز رہے

شبِ فرقت مین عشاق کم سے کم یار کے تصور ہی سے دل بہلاتے ہین، لیکن جگر کو یہ بھی گوارا نہین؛

چاہئے ترے تصور سے بھی ایسے مین گریز　　کیون کرے تجھکو شریکِ غمِ ہجران کوئی

عام شعرا کے یہان غمِ عاشقی جانگسل ہے لیکن جگر کا غمِ عشق جان نواز ہے،

ترے بغیر تو جینا روا نہین لیکن　　مین کیا کرون جو ترا غم ہی جان نواز رہے

غالب نے کہا ہے،

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب　　کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

جگر کہتا ہے،

جب حسن و عشق دونون ہو یا کرینگے مجھکو　　وہ بھی جگر زمانہ نزدیک آرہا ہے

میرے نزدیک اس شعر مین جگر کا تخیل غالب سے بہت آگے بڑھ گیا، غالب کو خود اپنے بعد اور تنہا عشق کی بیکسی پر رونا آتا ہے، لیکن جگر کے بعد حسن اور عشق دونون بے یار و مددگار ہو جائینگے،

عاشق کی جستجو کی آخری حد ناکامی ہے،

یہ حدِ آخری ہے عاشق کی جستجو کی　　بن بن کے مٹ رہی ہے ہر شکل آرزو کی

یہ نیا تخیل ملاحظہ ہو گو جگر خود رہینِ درد ہے لیکن اسکی تسلی کے لیے غمِ یار کی شیفتگی کافی ہے،

مین رہینِ درد سہی جگر مجھے اور چاہیے کیا جگر　　غمِ یار ہے مرا شیفتہ مین فریفتۂ غمِ یار ہون

غم کی مداومت اس سے زیادہ بلیغ پیرایہ مین کیا دکھائی جاسکتی ہے،

فانی نے کہا ہے،

نالِ سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ — بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

جگر کہتا ہے،

مری سمت سے اسے اصبا یہ پیامِ آخرِ غم سنا — ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزان ہے اپنی بہار پر

عشق کا خوش آیند آغاز اور اس کا حسرتناک انجام،

عجب انقلابِ زمانہ ہے مرا مختصر سا فسانہ ہے — یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوے یار پر

موجودہ دورِ تجدید و اصلاح کی بہت سی بدمذاقیون مین سے ایک بدمذاقی یہ بھی ہے کہ رنگین نوائی کو مذاقِ سلیم کے منافی سمجھا جاتا ہے، میرے نزدیک رنگینیٔ خیال اور رنگینیٔ ادا بھی شاعری کا ایک نہایت ضروری عنصر بلکہ رخسارِ شاعری کا گلگونہ ہے، کہ شاعری مین روح کی بیداری اور دل کی تڑپ کے ساتھ لبون کے تبسم اور چہرہ کی شگفتگی کا سامان بھی ضروری ہے ورنہ شاعری محض محفلِ وجد و حال کے لیے رہجائیگی، ہان اسمین اعتدال اور سلامت مذاق البتہ ضروری شرط ہے تاکہ وہ محض پرلطف شوخی تک محدود رہے، بازاری پھکڑ نہ بننے پائے، اس لحاظ سے جگر کی شاعری ان نغمہائے لاہوتی اور وادیِ ایمن کی شرر باریون کیساتھ جو روح کو بیدار اور جذباتِ ماسوا کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہین، اس رنگین عنصر کی لطیف آمیزش سے خالی نہین ہے اور انھون نے اپنی خوش مذاقی سے اس عنصر کو ایسا کھپایا ہے کہ کہین سے رنگ پھوٹنے نہین پاتا، اشعار ذیل ملاحظہ ہون،

جوانی کا کتنا صحیح اور پرکیف مرقع ہے،

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی — جوانی کا عالم ہے سرشاریان ہین

کس قدر بلیغ اور شاعرانہ تشبیہ ہے،

ان لبون کی جان نوازی دیکھنا — منہ سے بول اٹھنے کو ہے جامِ شراب

کس قدر پرکیف التجا ہے،

مین اپنی جان تو قربان کر چکون تجھپر — یہ چشمِ مست ابھی نیم باز رہنے دے

حسنِ یار کی بہار آفرینی دیکھئے،

دوڑا کے حسنِ یار کی ہلکی سی اک لہر — کانٹون کو مین نے رشکِ گلستان بنا دیا

حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو ملاحظہ ہو،

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو — مین یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آہی گیا

نگاہِ مست کے دور کا کیف،

کیفِ شباب و سرخوشیِ بادۂ حیات — کیا دور تھا تری نگہِ مست ناز کا

خیالات کی رعنائی کا پرتو،

حسن کے ہر جمال مین پنہان — میری رعنائیِ خیال بھی ہے

دوسرے الفاظ مین یہ کہہ سکتے ہین کہ حسن کو عشق کی رنگین نظرون نے حسن بنایا،

نگاہِ گستاخ کا اثر،

ہائے وہ چہرہ اور آئینہ وہ تڑپتی بجلیان — کاش اک دن پھر انھین گستاخ بنکر دیکھئے

نگاہِ مست کی مے باری،

جھک گیا ایک ایک میکش اس نگاہِ مست سے — تم ادھر دیکھا کئے اور لٹ گیا میخانہ آج

حسن کا جواب،

فروغِ بادہ ترے حسن کا جواب ہوا — سنبھالنا مجھے ساقی مین بے نقاب ہوا

بعض بعض غزلین پوری کی پوری خیالات اور بیان کی رنگینی مین ڈوبی ہوئی ہین لیکن لطافتِ ادا کی وجہ سے ان کی رنگینی بالکل گران نہین گذرتی،

خیال رنگین، نظام رنگین، کلام رنگین، پیام رنگین
قدم قدم پر زدش زدش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہین

شراب آنکھون سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی ابل رہی ہے
چھلک رہی ہے اچھل رہی ہے پیے ہوے ہین پلا رہے ہین

وہ روے رنگین وہ موج نسیم کہ جیسے دامان گل پہ شبنم
یہ گرمی حسن کا تماشا عرق عرق ہین نہار رہے ہین

خود اپنے نشے مین جھومتے ہین وہ اپنا منہ آپ چومتے ہین
خراب مستی بنے ہوئے ہین ہلاک مستی بنا رہے ہین

یہ موج دریا یہ ریگ صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیے ہین یہ سب کے سب مسکرا رہے ہین

اب آگے جو کچھ بھی ہو مقدر رہیگا لیکن یہ نقش دل پر
ہم ان کا دامن پکڑ رہے ہین وہ اپنا دامن چھڑا رہے ہین

خمریات موجودہ دور مین خمریات حضرت ریاض کا مخصوص حصہ سمجھا جاتا ہے اور ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے جو شاعر یہ شعر

اتنی پی ہو کہ بعد توبہ بھی
بے پئے بیخودی سی رہتی ہو

کہہ سکتا ہے اس کی خمریات کے نشہ مین کسی کو شبہہ نہین ہو سکتا، لیکن ریاض جگ بیتی کہتے ہین اور جگر آپ بیتی کہتا ہے وہ قال ہے اور یہ حال، اس لیے قدرۃً دونون کے کیف اور اثر مین نمایان فرق نظر آتا ہے، خمخانۂ ریاض کی مے بھی پر کیف ہے لیکن جگر کی خانہ ساز جیسی نشہ آور اور ہوشربا نہین ہے، جگر جو کچھ کہتا ہے عالم مستی مین کہتا ہے اس لیے اس کے رندانہ اشعار بادۂ ناب کے لبریز جام کا اثر رکھتے ہین جنکا ایک ہی جرعہ دیدون کو بھی مست بنا دیتا ہے، میرے نزدیک اگر جگر کے خمریات کے مقابلہ مین کسی کو پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ شاد عظیم آبادی ہین جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا، جگر کے خمخانہ مین ہر رنگ و بو ہر مزہ اور ہر درجہ کی شراب ہے اور اس کے اثرات بھی مختلف مین کسی مین خوشی کی حد تک نشہ، کسی مین مستی اور کسی مین بدمستی تک لیکن اس عالم بدمستی مین بھی جہان بڑے بڑے پاکبازون کے قدم ڈگمگا جاتے ہین جگر اپنے حواس قائم رکھتا ہے اور بڑبڑانے نہین لگتا، جس خمخانہ کا جگر مے نوش ہے اس کی مے نوشی کیلئے کچھ خاص قواعد و شرائط ہین چنانچہ سب سے مقدم شرط یہ ہے،

اسی کے واسطے بھی ہو مے کشی بھی جگر
جسے خبر نہین مے کیا ہے مے کشی کیا ہے

شاد نے کہا ہے،

مین نثار اپنے خیال پر کہ بغیر مے کے ہین مستیان
نہ تو خم ہے پیش نظر کوئی نہ سبو ہے پاس نہ جام ہے

اور

درد و صافی کا لحاظ آفت جان تھا ساقی
ولے ان بادہ کشون پر جنھین یہ ہوش رہا

اس کی مے پرستی بلا وجہ نہین بلکہ اس کا سبب یہ ہے،

نگاہ خاص سے چھلکا رہا ہے مے کوئی
وہ پاکباز نہین اب جو پاکباز رہے

اس سے بھی زیادہ صاف کہتا ہے،

پینا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشم یار کی شہ پا کے پی گیا

شاد نے کہا ہے،

مین فداے ساقی مہ لقا یہی میکشی کا ہو مسئلہ
وہی حکم دے تو حلال ہو وہی روک دے تو حرام ہے

جگر کی مے پرستی اس فلسفۂ اخلاق کے ماتحت ہے،

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاران کعبہ یک دل بہتر است

آزردگی خاطر ساقی کو دیکھکر
مجھکو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا

شاد نے کہا ہے،

ناصاف بھی دی ہو تمھین ساقی نے تو رندو
لے لو بہ ادب کچھ نہ کہو پیر مغان سے

ترک شراب کی بے کیفی رند قدح نوش کے لیے موت سے کم نہین، اس لیے جگر اپنی مے نوشی کے جواز کے لیے یہ عذر شرعی پیش کرتا ہے،

بے کیفیون کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کے ہر خیال کو ٹھکرا کے پی گیا

شرب باضطرار شریعت مین معاف ہے اس لئے جگر کہتا ہے،

اے رحمت تمام میری ہر خطا معاف — مین انتہاے شوق مین گھبرا کے پی گیا

مے پرستی کا منتہاے کمال یہ ہے،

اس جانِ میکدہ کی قسم بارہا جگر — کل عالمِ بسیط پہ مین چھا کے پی گیا

خمریات کی بعض بعض کیفیتین ناقابل تشریح ہین،

چھلک گیا ایک ایک میکش اس نگاہ مست سے — تم ادھر دیکھا کئے اور لٹ گیا میخانہ آج

یہی تخیل کسیقدر ترمیم کے ساتھ شاد کے یہان بھی موجود ہے،

دیکھا کئے وہ مست نگاہون سے بار بار — جب تک شراب آئی کئی دور چل گئے

مختلف نمونے:

کھینچ کر اک آہ کس نے رکھدیا جامِ شراب — دیدنی ہے اضطرابِ ساقی و پیمانہ آج

بادۂ ناب عجب چیز ہے ساقی لیکن — اور ہی کچھ ترے ہاتھون سے مزا آتا ہے

پی کے اک جامِ شرابِ شوق آنکھین کھل گئین — دیکھتا ہون جسطرف میخانہ ہی میخانہ ہے

شوخی رندانہ رندون اور واعظون مین بہت پرانی نوک جھونک چلی آتی ہے اور جب تک ان دونون کا وجود دنیا مین باقی رہیگا دونون کی چشمک چلی جائیگی، اس لیے کہ نہ اس کے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی چھوٹیگی اور نہ حضرت واعظ اپنے مذہبی فریضہ سے چوکینگے، اور حشر تک یہ زور آزمائی قائم رہے گی، واعظ کے پند اور رندون کی چوٹون مین بڑا فرق ہے، حضرت واعظ اپنا فرض ادا کر کے خاموش ہو جاتے ہین اور کسی کو خبر بھی نہین ہوتی، لیکن رندون کی شوخ پھبتیان گلی گلی اور کوچہ کوچہ مین پھیلکر شوخ طبع بے فکرون مین واعظ کو سامانِ تفریح بنا دیتی ہین، بعض بے باک رندون نے تو عالمِ بدمستی مین واعظ کی پگڑی تک اچھال دی ہے اور ان کی قباے زہد پر بے گلگون کے چھینٹون کی گلکاری سے بھی باک نہین کیا، اور بعضون کی شوخیان محض رندانہ چوٹون تک محدود رہتی ہین، جگر بھی انھین مہذب رندون مین ہے، اس نے بھی

واعظون پر نہایت لطیف اور ظریفانہ پھبتیان کہی ہین لیکن تہذیب کا دامن کہین ہاتھ سے نہین چھوٹنے پایا ہے، واعظ جو کچھ کہتا ہے وہ اپنی کتابی پوٹ کے بل پر کہتا ہے، لیکن جگر اپنے سامانِ رندی کے مقابلہ مین واعظ کے "بارِ علم" کی یہ حیثیت سمجھتا ہے،

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھون اے واعظ — مین اپنا ساغر اٹھاتا ہون تو کتاب اٹھا

واعظِ بدمست جگر کو اٹھانے کے لیے بڑھتا ہے، جگر یہ شوخ و رندانہ جواب دیتا ہے،

مجھے اٹھانے کو آیا ہے واعظِ نادان — جو اٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اٹھا

"اٹھ سکے" کے لفظ سے واعظ کی کتنی تحقیر ہوتی ہے، یعنی ساغر کا بار علم کے بار سے بڑھ کر ہے، شاد نے اسی مضمون کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ اس سے زیادہ شوخ کہا ہے،

بارِ سبو وہی اٹھائے جسپہ ہو فضلِ مے فروش — زاہدِ خشک یہ بھی کیا بوجھ ہے جانماز کا

زاہد بادۂ کوثر کی لو لگائے ہوے ہے، جگر اس کے لئے مے نوشی کے جواز کا یہ پہلو نکالتا ہے اور در پردہ اس کے انتظارِ بادۂ کوثر پر چوٹ بھی کرتا ہے،

پی بھی جا زاہد خدا کا نام لیکر پی بھی جا — بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانہ مین ہے

زاہد کے چہرہ کے نور کا کیسا رندانہ اور دلچسپ سبب بیان کرتا ہے،

ہو گیا کیا مریدِ مے زاہد — اب تو چہرہ پہ نور رہتا ہے،

جگر نے عالمِ بدمستی مین زیادہ سے زیادہ بارگاہِ زہد مین جو بے ادبی کی ہے اسکا نمونہ یہ ہے،

غرق کر دے تجھکو زاہد تیری دنیا کو خراب — کم سے کم اتنی تو ہر میکش کے میخانہ مین ہے

اخلاق جگر غزل گو شاعر ہے جس کا کام صرف جذبات کی مصوری ہے وہ کوئی معلمِ اخلاق، حکیم اور واعظ نہین کہ اخلاقی درس دینا اس کا فرض ہو، اس لیے اس کی شاعری مین اخلاق کا حصہ بہت کم ہے، لیکن اس حیثیت سے کہ اخلاق بھی ایک حد تک شاعری کے حدود مین داخل ہے اس لیے جگر کا کلام درسِ اخلاق سے بالکل

خالی نہین ہے،

رہِ طلب مین نہ کر خوفِ لغزشِ پا سے
یہان جو گر کے اٹھا بس وہ کامیاب اٹھا

مجھے آغوشِ طوفان ہی جگر آغوشِ ساحل ہے
وہ کوئی اور ہونگے جو ساحل دیکھنے والے

ہر طرف بے فائدہ کیون سعیِ پیہم کیجیے
تشنگی سے اپنی پیدا بحرِ اعظم کیجیے

فضائے عالمِ ہستی پہ جب کرینگے نظر
ہر ایک موج کو موجِ سراب دیکھینگے

پروردۂ طوفان کو کشتی کی نہین حاجت
موجون کے تلاطم مین ساحل نظر آتا ہے

مختلف نمونے اوپر مختلف سرخیون کے ماتحت کافی منتخب اشعار لکھے جا چکے ہین پھر بھی ابھی بہت سا حصہ رہا جاتا ہے، اس لیے آخر مین ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے چند منتخب اشعار بلا کسی ریویو کے نقل کیے جاتے ہین،

ہر تڑپ کے ساتھ اک جلوہ نمایان ہو گیا
آج ثابت یار کا قربِ رگِ جان ہو گیا

کس نظر سے آج وہ دیکھا کیا
دل مرا ڈوبا کیا اچھلا کیا

آہ یہ عالمِ کثرت تری رعنائی کا
ایک مرکز نہ رہا چشمِ تماشائی کا

نگہِ شوق کی جذب و کشش لے توبہ
جس آئینہ پہ نظر کی ترا جواب ہوا

عین قربت بھی عین فرقت تھی
ہائے وہ قطرہ جو حباب ہوا

جز ترے کچھ نظر نہین آتا
آرزو بن گئی مجسم کیا

کمالِ عشق مین احساس اتنا تیز ہو جاتا
جو چھو جاتی ہوا دل دردسے لبریز ہو جاتا

آلودۂ خاک ہی مین رہنے دو اسکو ناصح
دامن اگر جھٹک دون جلوے کہان سمائین

جو دل سے اٹھتے ہین شعلے وہ رنگ بن بنکر
تمام منظرِ فطرت پہ چھائے جاتے ہین

مین اپنی آہ کے صدقے کہ میری آہ مین بھی
تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہین

بجھا رہا ہون آتشِ عصیان ہر ایک سمت
پھیلا رہا ہون رحمتِ پروردگار کو

خمستان فارس "خمخانۂ ہندی" کی شرابِ ناب کے بعد ناظرین "بادۂ شیراز" کا بھی تھوڑا سا مزہ چکھ لین جگر نے فارسی کلام مین حافظِ شیراز کے تتبع کی کوشش کی ہے اور جہانتک بیان کی رنگینی اور خیالات کی باریکیون کا تعلق ہے نہایت کامیاب جرعہ اڑایا ہے لیکن ابھی "بادۂ شیراز" سے کہین کہین "شرابِ ہندی" کی بو آتی ہے، اور زبان مین خالص فارسیت نہین پیدا ہوئی ہے، اور اسمین کافی مشق و ممارست اور فارسی اساتذہ کے کلام کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاہم جگر کا فارسی کلام بھی لطف سے خالی نہین ہے، یہ حصہ نہایت مختصر ہے یعنی صرف چند غزلین اور بعض مسلسل نظمین ہین اس لیے اسپر مستقل تبصرہ کی گنجایش نہین صرف نمونۃً کچھ اشعار نقل کر دیے جاتے ہین "خطاب بہ مسلم" کی مسلسل اور سبق آموز نظم خوب ہے غزل کا نمونہ یہ ہے

شراب و ساغر و سبزہ گل و بہار و آب جو
دو صد جہانِ رنگ و بو نمود یک جہانِ ما

بیا بنوش جامِ مے چہ جامِ مے تمام مے
کہ ما داذنِ عامِ مے خوش است امتحانِ ما

آوارہ ہر نگاہ ز جرمِ نگاہ کیست
دیدن گناہِ ماست نہ دیدن گناہ کیست

دیوانہ وار جان بہ فشاندن گناہ ماست
بیگانہ وار رخ نہ نمودن گناہ کیست

صد نقشِ سجدہ تا درِ بت خانہ دیدہ ایم
این ہم جگر اشارۂ طرفِ کلاہ کیست

بے کیفیت عاشق صد کیف و اثر دارد
زین سرِ نہان لیکن ہر کس نہ خبر دارد

در عینِ وصالِ او یا بم اثرِ دوری
اے پیرِ رہِ عشقم این پردہ کہ بر دارد

مفتی بحقِ منصور بنوشت عجب فتوی
کافی است پئے قتلش این جرم کہ سر دارد

من عاشقِ آن شوخم کو از سرِ محبوبی
مانوس دلے دارد بیگانہ نظر دارد

غافل زدلم منشین جانان ز سرِ مستی
صد نغمہ برانگیزد سازے کہ تو بشکستی

بلبل ہمہ تن خون شد گلہا ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر این ست بہارے

اغیار بدل خندہ زن دل بتو مشغول
خلقے پس دیوانہ و دیوانہ بکارے

تلخیص و تبصرہ

اسلام مڈگاسکر مین

"مدغاسکر، بحر ہند مین سواحل افریقہ کے قریب اسلام کا بہت پرانا مرکز ہے، یہان پہلے عمانی عربون اور بعد کو خلیج فارس کے ایرانی تاجرون کی آبادی ہی، یہان اسلامی سلطنتین بھی قائم ہو چکی تھین، آج کل جو اسکی کیفیت ہے، اوسکا حال امریکہ کے عیسائی مشنری رسالہ "اسلامی ورلڈ" سے معلوم ہوگا، امید ہے کہ ہمارے ناظرین اوسکو نگاہ عبرت سے پڑھین گے،"

عرب جہازرانون مین اس جزیرہ کا نام قنبلو مشہور تھا، ایک خیال یہ ہے کہ مدغاسکر اصل مین مدعسکر تھا یعنی لشکر کی آخری مسافت، کیونکہ عرب جہازران اپنے سواحل سے چلکر اس جزیرہ سے آگے نہین بڑھتے تھے یعنی اس سمندر مین اس سمت مین یہی اون کی آخری حد تھی،

مڈگاسکر کی آبادی جو اپنی وسعت کے لحاظ سے دنیا کا تیسرا جزیرہ ہے تخمیناً تیس لاکھ سے زیادہ ہے، مسینان (Massignon) ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق وہان کی آبادی کی تعداد (۳۵۴۵۵۷۵) بتاتا ہے، لیکن اسمین جزائر کومورو کے باشندے بھی شامل ہین، مسلمانون کی تعداد (۶۶۹۲۰۰) ہے یعنی کل آبادی مین اٹھارہ فی صدی اگرچہ باعمل مسلمانون کا شمار دراصل اس سے بہت کم ہے، کثرت تعداد اون لوگون کی ہے جو کائنات کی ہر شے مین حیات کے وجود کے قائل ہین، حالانکہ تبلیغی کوششون کی ترقی کے ساتھ دین مسیحی کی نشر و اشاعت بھی وہان یقینی ہے،

اس جزیرہ کے جو حالات عرب جغرافیہ دانون نے لکھے ہین ان مین سب سے زیادہ قدیم [1] اور مفصل بیان ادریسی کی

[1] معارف:- یہ غلط ہے، ادریسی سے دو سو برس پہلے اسکا حال مسعودی نے مروج الذہب کی پہلی جلد مین لکھا ہے،

کی کتاب نزہۃ المشتاق (۱۱۵۴ء) مین ملتا ہے، اہل یورپ مین سب سے پہلے ایک پرتگالی جہازران ڈیگوڈائیس (Deigo Dias) نے سینٹ لارنس کے دن (۱۰ اگست ۱۵۰۰ء) مڈگاسکر کو دیکھا، اسی وجہ سے کچھ دنون تک اس جزیرہ کو سینٹ لارنس کہتے تھے، دین مسیحی کی ابتدا وہان اول اول پرتگالی پادریون نے کی،

ماہرین علم انواع البشر نے مڈگاسکر کے باشندون کی دو تقسیمین کی ہین، (۱) ملائی اور افریقی، پہلی شاخ مین ہلکے رنگ کے نسل ہووا (Hovas) کے لوگ ہین جو صاحب اثر و اقتدار ہین، اور جو دسوین صدی عیسوی کے قریب اس جزیرہ مین پہنچے تھے، نیز دوسری قومین بھی شامل ہین، مثلاً بٹسیلیو (Betsileo) اور بٹسیمارکا (Betsimaraka) دوسری شاخ مین سیاہ فام افریقی النسل سکالوا (Sakalava) ہین، متعدد دوسری قومین مثلاً تیمورو (Taimoro) تیفاسی (Taifasi) اور تانوسی (Tanosi) انھی دونسلون سے مخلوط ہین، اور ساحلون پر کثرت سے سواحلی عرب اور ہندوستانی آباد ہین، اگرچہ فرانس نے ۱۶۴۲ء ہی مین اس جزیرہ پر قبضہ کا دعوی کیا تھا، لیکن اوسکے حقوق ۱۸۸۵ء مین ایک صلحنامہ کی رو سے متعین کئے گئے، آج بھی اس کا اثر دارالسلطنت انٹانانا ریوو (Antananareio) سے جو گورنر جنرل کی جائے قیام ہے، زیادہ دور تک نہین پہنچا ہی،

فرانسیسی فاضل مسینان، مڈگاسکر اور اوسکے زیر فرمان جزائر کومورو کی فرانسیسی نوآبادی کے اصلی باشندون کو تین گروہون مین تقسیم کیا ہی،

۱- کومورو کے اصلی باشندے (۱۰۶۰۰۵) جو سب کے سب پرجوش مسلمان ہین، مع اون لوگون کے جو ساحل پر رہتے ہین اور تقریباً مسلمان ہو چکے ہین،

۲- شمال مشرق اور مغرب کے سکالوا، جنمین مسلمانون کی تعداد (۲۰۹۰۰۰) ہی،

۳- جنوبی مشرقی اقوام صوبہ جات فارافنگانا، منانجارا، فورٹ ڈافین، اور بٹروکا مین (۲۵۳۰۰۰ مسلمان)

۱- جزائر کومورو کی پوری آبادی مسلمانون کی ہے، یہ مذہب شافعی کے پیرو ہین، اور اونکی علمی زبان سواحلی ہی، اونھون نے اول اول خلیج فارس کے تاجرون کی وساطت سے نوین صدی عیسوی مین اسلام لانا شروع کیا، کومورو کے نام سے مڈگاسکر کے قدیم عربی نام جزیرۃ القُمر کا پتہ لگتا ہی، جسے غلطی سے جزیرۃ القمر سمجھ لیا گیا، یہی نام پندرہوین صدی کے عرب جغرافیہ دان ابن ماجد نے اپنی کتاب الفوائد مین لکھا ہے، مڈگاسکر مشتق ہے مارکو پولو کے میڈی گاسکر سے جس کے متعلق فران (Ferrand) کا خیال ہے کہ یہ دراصل میڈی گاس بار یعنی ملاگاسیون کا ملک تھا، ٹھیک اوسی طرح جس طرح زینزی بار کے معنی ہین زنگیون کا ملک،

جزائر کومورو مین جنمین چار استقلالی جزیرے انگازیجا (Angazija) انزوان (Anzhuan) مایوتا (Mayota) اور موہیلی (Moheli) شامل ہین، سولہوین صدی سے جدا جدا سلاطین کی حکومت ہے،

الف- سلطان انگازیجا (غازیجا) موروبی مین رہتا ہے، جہان سینک کے بیان کے مطابق فرقہ شاذلیہ کے درویشون کی ایک بڑی خانقاہ ہی،

(ب) سلاطین انزوان شیرازی خاندان سے ہین، جسے سنہ ۱۵۰۶ء مین محمد بن عیسیٰ نے قایم کیا تھا، اونھون نے دوموتی کی قدیم مسجد جس کی محراب سفید مونگے کی ہے، اور سلطان عبداللہ ثالث کا محل مباموُ مین بنوایا،

(ج) سلاطین مایوتا عیسیٰ بن محمد کی اولاد سے ہین، جو انزوان کے پہلے سلطان کا بیٹا تھا، دار السلطنت مین سنہ ۱۵۶۶ء کی بنی ہوئی ایک مسجد اور آمنہ متوفیہ ۱۵۹۶ء کا ایک مقبرہ ہے، جو نیلے رنگ کی چینی کا بنا ہوا ہے، عرب خاندان کے ایک مختصر دور حکومت کے بعد آخری سلطان کے وارث نے اس جزیرہ کو فرانس کے حوالہ کر دیا،

(د) سلاطین موہیلی کا جو شیرازی الاصل تھے، جانشین سنہ ۱۸۳۰ء مین ایک جلا وطن ہووا ہوا جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور جس کا نام رامانلاکا (Ramanelaka) تھا،

۲- سکالوا شمال اور جنوب دونون کے اثرات سے اسلام سے آشنا ہوئے، شمال مین اونھون نے موجنگی سے بنی ہوئی نوسی لنگانی (Nosi Langany) کی مختصر عرب سلطنت کا اثر قبول کیا لیکن یہ اثر کچھ زیادہ نہ تھا، موجنگا کی دونون مسجدین سکالوا کے لئے نہین ہین، بلکہ ایک سُنّی زنجباریون اور کومورو کے اصلی باشندون کے لئے اور دوسری ہندوستانی اہل تشیع کے لئے ہے، سینان اس حصہ ملک کے بہت سے قدیم مسلمانون کے مقبرون کا بھی ذکر کرتا ہے، سکالوا کے ہان عربی تقویم رائج ہے، اور ان کا علم رمل اُن عربی کتابون سے جو بظاہر علم جفر کی ہین نیز شیخ محمد زناتی کی کتاب الفصل فی اصول علم الرمل سی ماخوذ ہی، یہ لوگ رمضان مین روزے نہین رکھتے، اور اون کے ہان شراب نوشی بھی جائز ہے،

۳- سنہ ۱۸۴۶ء مین ملایا کے بعض مسلمان خاندان حج بیت اللہ سے لوٹتے ہوئے منانجارا مین مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے، اون کی آمد کا اثر بھی مڈگاسکر کے جنوبی مشرقی حصہ پر پڑا، اون کی اولاد کے پاس عربی رسم خط مین لکھی ہوئی اسلامی کتابون کے اکثر ترجمے ملاگاسی زبان مین موجود ہین یہ قلمی مسودات آیات قرآنی اسمای باری تعالیٰ، ملائکہ، احادیث نبوی، طب سحر کاری، اور علم نجوم سے متعلق ہین،

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان مین آیات قرآنی کی ترتیب حضرت عثمانؓ کی ترتیب کے مطابق نہین ہی،[۱]

مذکورہ بالا مسودات کو غور سے دیکھنے کے بعد مڈگاسکر مین مسلمان نوواردون کی متعدد آمد کے متعلق فران حسب ذیل نتائج پر پہنچا ہے،

(۱) عربون کی آمد چھٹی صدی سے نوین صدی تک جب کہ بہتیرے اصلی باشندون نے اسلام

[۱] **معارف**:- یہ اس لئے ہے کہ وہ مکمل قرآن نہین، بلکہ منتخبات شور ہین، جیسے پنج سورہ وغیرہ کا رواج ہندوستان مین ہے،

(غالباً سنی مذہب قبول کیا)

(۲) فرقۂ اثنا عشریہ کے ایرانی شیعہ جو علی الرضا کے دورِ حکومت (۸۱۶ئ تا ۸۱۸ئ) کے بعد پہنچے،

(۳) دوسرے عرب نوواردجو آخری عباسی خلیفہ مستعصم کے عہدِ حکومت مین تیرہوین صدی کے وسط مین آئے،

اور جو باتین اہل مڈگاسکر نے عربی ماخذون سے لین، وہ یہ ہین :-

(۱) ہفتہ کے دنون کے نام،

(۲) بارہ مہینون کے نام جو منطقۃ البروج کے عربی نامون کی نقل ہین،

(۳) قمری مہینہ کے اٹھائیس دنون کے نام،

(۴) جنرورل کے مشکل قواعد،

(۵) غسل کی عظیم الشان سالانہ تقریب جو مسلمانون کی عید الفطر سے مشابہ ہے،

فران یہ بھی لکھتا ہے کہ مڈگاسکر کے قدیم پرتگالی سیاحون کا بیان ہے، کہ وہان کے جنوبی مشرقی حصہ کے رہنے والے مسلمان رمضان مین روزے رکھتے تھے، نمازین پڑھتے تھے، اور قرآن کی تلاوت کرتے تھے، لیکن شراب پیتے تھے، اور سور کا گوشت کھاتے تھے، مڈگاسکر کے مسلمانون کے ضعف ایمان کی مزید شہادت اس امر سے بھی ملتی ہے، کہ جب وہان فرانس کا قبضہ ہوگیا، تو یہ لوگ اپنے حکام کو خوش کرنے کے خیال سے کثیر تعداد مین عیسائی ہونے کے لئے تیار ہوگئے، حکومت فرانس کو اونھین یہ بتانا پڑا، کہ ہر شخص اپنے ذاتی مذہب کی پیروی کے لئے آزاد ہے، بشرطیکہ وہ قوانین ملک کی پابندی کرے، یہ تمام باتین وہان کے لوگون کی ذہنیت کے عین مطابق ہین، چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ اگر حکومت کی طرف سے متعین طور پر اونھین مذہبی تعلیم نہ دی جائے تو مذہب کی جانب سے اون کی لاپروائی سرعت کے ساتھ پھیلتی جائے گی، یہان تبلیغی کوششون کے لئے بہت وسیع میدان ہے، اور یہ صورتِ حال خود

مسلمانون کی نظرون سے بھی پوشیدہ نہین ہے،

زمانۂ حال مین احمدیہ اور اسمٰعیلی فرقہ کے لوگون نے اس جزیرہ مین تبلیغ اسلام کی کوششین کی ہین لیکن صرف مغربی ساحل ہی ایک ایسا مقام ہے جہان اسلام قریب المرگ نہین ہے، تمدنی حیثیت سے وہان کی غیر مسلم قومین اپنے مسلمان بھائیون سے زیادہ ترقی کر رہی ہین، اور جہان تک خود مڈگاسکر کا تعلق ہے، وہان کی مسلم اقلیت نسبتہً ناقابلِ لحاظ ہے،

"مسلم ورلڈ"   "ع ز"

سلطان التمش کا صحیح نام،

سلطان شمس الدین التمش جو ہندوستان کا تیسرا غلام بادشاہ تھا، اور جس نے ۶۰۷ھ سے ۶۳۳ھ تک دہلی کے تخت پر حکمرانی کی، اس کا صحیح نام کیا تھا؟ ہندوستان کے اکثر ابتدائی بادشاہ ترکی النسل تھے، اسلئے اون کے نام بھی ترکی ہوتے تھے، جنکی اصلیت سے ہندوستانی مورخین کم واقف ہوتے تھے،

سلطان شمس الدین کا نام عام طور سے التمش مشہور ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ لفظ ترکی ہے، لیکن ترکی مین یہ لفظ اپنی موجودہ صورت مین بے معنی ہے، ابھی حال مین اسکول اور نٹیل اسٹڈیز لندن کے بلیٹن (جلد ۷، حصہ ۴، ص ۱۱۱) مین ایک مختصر نوٹ چھپا ہے، جسمین صاحب قلم نے یہ بتایا ہے، کہ التمش کا صحیح ترکی تلفظ ایلتتمش ہے، اور اوسکے معنی کشورکش، یا عالمگیر اور جہانگیر کے ہین،

ہندوستان کی فارسی تاریخون مین یہ نام "التمش" کی صورت مین ملتا ہے، صحیح نام کی دریافت کے لئے سلطان کے سکون کی طرف توجہ کی گئی، برٹش میوزیم ۱۸۸۴ء کے سلاطین دہلی کے سکون مین اس سلطان کا ایک سکہ ہے، جس پر ناگری خط مین اوس کا نام "لی تمی" پڑھا جاتا ہے، میوزیم کے کیٹلاگ مین پورا نام ناگری خط کے سکون پر سری سلطان لی تمی سنہ ۱۲۸۳ سمبت پڑھا جاتا ہے،

مضمون نگار نے برٹش میوزیم کے محقق آثار مسٹر الان (ALLAN) سے دریافت کرنے

پر یہ جواب پایا،

میں سمجھتا ہون کہ التمش نام برٹش میوزیم کیٹلاگ سلاطین دہلی نقش ۲، نمبر ۳ کے بے احتیاطانہ پڑھنے کے سبب سے ہوا ہے، اس سکہ مین نقاش سے جگہ کی کمی کے باعث کچھ حرف کم کرکے رہ گئے ہین سکون پر عربی خط مین یہ نام دو طرح سے واقع ہوتے ہین، "التمش" اور "ایلتمش" "دو ت" ہونے مین کوئی شک نہین……… ناگری خط کے کئی سکون کے ملانے سے نام اس طرح پڑھا جاتا ہے، سری سلطانا ایلی تیتمشی سمہ ۱۲۸۳ سمت (ہندی سنہ)………

مضمون نگار کہتا ہے کہ طبقات ناصری مین (جو سلطان کی معاصر تاریخ ہے،) اوسکے کلکتہ اڈیشن مین یہ نام دو جگہ شعراء کے دو قصیدون مین آیا ہے، ان دونون مقامون پر اس اڈیشن مین التمش چھپا ہے، مگر شعرون کے وزن کا اقتضا یہ ہے کہ اوسکو التمش کے بجائے ایلتمش پڑھا جائے،

صفحہ ۱۹۰ مین طبقات ناصری کے مصنف قاضی سراج نے سلطان معز الدین بہرام شاہ بن شمس الدین ایلتمش کی مدح مین ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا تیسرا شعر یہ ہے:-

اگر سلطانی ہند است ارث دودۂ شمسی
بحمد اللہ فرزندان تو ئی ایلتمش ثانی

پھر طبقات کے صفحہ ۲۰۰ پر قاضی منہاج نے اپنا دوسرا قصیدہ لکھا ہے، جس کا مطلع یہ ہے،

آن شہنشاہی کہ حاتم بذل و رستم کوشش است
ناصر دنیا و دین محمود بن التمش است

ان دونون شعرون مین وزن کا اقتضا ہے کہ التمش کے بجائے ایلتمش پڑھا جائے،

معارف:- اس دوسرے شعر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایلتمش کی میم کو زیر کے بجائے جو مشہور ہے، زیر کے ساتھ پڑھنا چاہئے، تاکہ کوشش کا ہم قافیہ ہو سکے، پورے قصیدہ مین تمام قافیے اسی طرح ہین جن مین

ش سے پہلے کا حرف زیر کے ساتھ ہی،

التمش کے بجائے ایلتمش کے صحیح ہونے کی ایک مزید شہادت یہ ہے کہ مورخ ابن اثیر نے جو سلطان کا معاصر تھا اپنی تاریخ کامل مین اوس کا نام شمس الدین الترمش لکھا ہے، (کامل ابن اثیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۰۲ مطبوعہ بریل یورپ و جلد ۱۲ ص ۱۲۰ مطبوعہ ۱۳۰۳ھ مصر) ایک اور دوسرے ترکی کا نام اوس نے "الدتمش الترک" لکھا ہے، (کامل ابن اثیر جلد ۱۲ صفحہ ۲۵۷ بریل) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی ل کے بعد ایک اور حرف ہے، جو عربی تلفظ مین کہین "ر" اور کہین "د" ہو گیا ہے،

"س"

رسالہ معراج النبی صلعم

مولفہ حضرت مولانا مولوی احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور،

مسلمانون کا فرض ہے کہ اسلامی رسوم اور دینی تہوارون کو اللہ تعالے اور اوسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق ادا کرین، ورنہ خطرہ ہے کہ مال بھی لٹائین اور خدا تعالی کو بھی ناراض کر بیٹھین، لہذا اگر آپ چاہتے ہین، کہ معراج نبوی کی اصلی حقیقت قرآن اور حدیث کی روشنی مین دیکھین، اور اوس کے اصلی اور نقلی دلائل سے آگاہ ہون اور آسمانی تحفہ معراج کا پتہ لگائین، تو مندرجہ ذیل پتہ پر ایک آنہ کا ٹکٹ محصول ڈاک و پیکنگ بھیجکر رسالہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم مفت منگوا کر ملاحظہ فرمائین، بلکہ ہو سکے تو زیادہ ٹکٹ بھیج کر زیادہ تعداد مین منگوائین اور دوست احباب مین تقسیم فرما کر اشاعت و تبلیغ کا ثواب پائین،

المعلن

ناظم شعبہ تالیف اشاعت انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ لاہور،

اخبار علمیہ

حالتِ خواب مین دماغ کی مصروفیت

مفکرین، اربابِ علم وفضل، ماہرینِ فنون وصنائع اور موجدین ومخترعین نے بار بار اسکو بیان کیا ہے، کہ انھین کسی مسئلہ کا حل، کسی صنعتِ لطیف کا محرک، کسی مشکل خیال کا سلجھاؤ جسے باوجود دقتون کی سعی وکاوش کے وہ حالتِ بیداری مین حاصل نہ کر سکے تھے، دفعۃً اور بالکل غیر متوقع طور پر حالتِ خواب مین ہاتھ آگیا، لیکن دوسری طرف وہ ممتاز اہلِ علم ہین جنکو اس کے امکان سے انکار ہے، اور وہ اسے دھوکا یا قوتِ حافظہ کی غلطی کہتے ہین، اس مسئلہ کے متعلق پروفیسر بیج (PROF. BAEGE) جنا یونیورسٹی کی رائے ہے کہ جو شخص خواب مین قوائے طبعی کا کوئی خاص مظہر دیکھتا ہے وہ اول الذکر خیال کو تسلیم کرنے کی طرف مائل ہوگا، لیکن جو حالت خواب مین کامل دماغی سکون پاتا ہے جبکہ تمام دماغ گویا بالکل معطل ہوجاتا ہے، وہ ضرور اس خیال کی تردید کرے گا کہ سونے کی حالت مین کسی قسم کا دماغی کام ممکن ہے، نیند کے متعلق جدید تحقیقات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ان دو متضاد نقطہ ہائے نظر مین سے کوئی بھی اصلی واقعات کے مطابق نہین ہے، حالتِ خواب مین خاص قوائے طبعی کام نہین کرتے اور نہ دماغ کی تمام مصروفیت نیند کی حالت مین موقوف ہوجاتی ہے، بلکہ گہری نیند کی حالت کے علاوہ جو صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ رہتی ہے، ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ کا کوئی ایک ہی حصہ حالتِ سکون مین ہوتا ہے اور اس کے دوسرے حصے آرام نہین کرتے بلکہ خصوصاً ایسی صورت مین کہ حالتِ بیداری مین دماغ حد سے زیادہ زور اور محنت برداشت کرچکا ہے، اپنی مصروفیت کو جاری رکھتے ہین، پروفیسر ہوش (HOCHE)

فرائی برگ یونیورسٹی نے ایک سو یونیورسٹی پروفیسرون کی رائین اس مسئلہ سے متعلق حاصل کی ہین، وہ لکھتے ہین:

"ایک پروفیسر کا بیان ہے کہ ڈاکٹر کی ڈگری کے لیے جو مقالہ اس نے پیش کیا تھا اسمین اُسے ریاضی کی دقتون کا سامنا ہوا، ایک روز رات کو وہ بہت مغموم ہوکر سونے کے لیے بستر پر گیا، کیونکہ وہ اس دقت کو حل کرنے مین کامیاب نہ ہوسکا تھا، اُسے اچھی نیند نہ آئی، دورانِ خواب مین بھی وہ اس مسئلہ پر غور وخوض کرتا رہا، جب دوسرے روز صبح کو وہ بیدار ہوا تو اس نے وہ مسئلہ حل کرلیا تھا، دوسرا فاضل لکھتا ہے کہ دن مین وہ ایک قبطی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کررہا تھا جس کا ایک لفظ خاص طور پر مشکل تھا، جب وہ سوگیا تو خواب مین بھی اُسنے وہی تحریر پڑھنی شروع کی اور پھر اُسی مشکل لفظ پر آکر رکا، دفعۃً اس کے ذہن مین یہ بات آئی کہ ممکن ہے یہ لفظ لغت مین فلان مقام پر مل جائے، وہ جاگا، فوراً اٹھ کر لغت دیکھا اور اسی وقت اس دقت کو رفع کرلیا، آرٹ یا سائنس کے بعض مسائل جو بظاہر حالتِ خواب مین حل ہوتے ہین اُنکی صورت یہ ہوتی ہے کہ مقدمات اور ان کے نتیجہ کا آخری درمیانی تعلق جو بیداری کی حالت مین نہ مل سکا تھا، نیم بیداری کی حالت مین قائم ہوجاتا ہے،

جھوٹون کی گرفت

جب کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو ساتھ ساتھ اس سے اور بہت سی باتین بھی عمل مین آتی ہین جنکی گرفت اگر ہم کرسکین تو اس کے جھوٹ کو بھی پکڑ سکتے ہین، علم کی یہ جدید شاخ صرف دس بارہ سال قبل دریافت کی گئی اور سرعت کے ساتھ ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کرتی جاتی ہے، تفتیش کے اس جدید طریقہ کو عمل مین لانے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بے گناہ بری ہوجاتے ہین، جس وقت کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے اس کے خون کا دباؤ بہت بڑھ جاتا ہے، اسکی نبض کی رفتار تیز ہوجاتی ہے اور اسکی سانس بدل جاتی ہے، یہ کیفیت ایک آلہ کے ذریعہ سے معلوم ہوجاتی ہے جسے مشتبہ شخص کے جسم پر لگاتے ہین، اس آلہ کو "پولی گراف" (POLYGRAPH) کہتے ہین،

امریکہ مین ہزارون مشتبہ اشخاص کی جانچ اس آلہ کے ذریعہ سے کی گئی، اور اسطرح بہتیرے خفیہ جرایم کا پتہ لگایا گیا، سیکڑون جرائم از قسم سرقہ، ڈاکہ، تغلب وغبن، جرائم جنسی، قتل وخونریزی وغیرہ وغیرہ کا اقرار اسی آلہ کے ذریعہ سے حاصل کیا گیا. تفتیشِ جرائم کا یہ طریقہ اگرچہ گذشتہ دس سالون سے ہزارون مجرمون اور مشکوک لوگون پر کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جارہا ہے تاہم ابھی اس مین ترقی کی بہت کچھ گنجایش باقی ہے، اور برابر اس مین اصلاحین کیجارہی ہین، روز بروز یہ طریقہ زیادہ قابلِ اعتماد ہوتا جاتا ہے اور امید کیجاتی ہے کہ ایک روز یہ بھی عدالتون اور پولیس کے محکمون مین اسی وثوق کے ساتھ استعمال کیا جاسکے گا، جسطرح انگوٹھے کے نشانات آج استعمال کئے جارہے ہین،

عقدہ کی عقدہ کشائی،

رسی یا ڈور کی گرہین جو کسی جرم کے سلسلہ مین پائی جاتی ہین، اب امریکہ مین جرائم کی تفتیش کرنیوالے اسی احتیاط سے رکھتے ہین جس احتیاط کے ساتھ انگوٹھے کے نشانات رکھے جاتے ہین، ان لوگون کا تجربہ ہے کہ اکثر اوقات گرہون کی نوعیت سے مجرم کی شناخت ہوجاتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ مختلف قسم کے لوگ عادۃً مختلف قسم کی گرہین دیتے ہین، چنانچہ کپڑا بننے والے، مویشی اور گھوڑے رکھنے والے، لکڑی اور گاڑی والے، اطباء، کاشتکار اور جہازران، یہ سب جدا جدا قسم کی گرہین دیتے ہین، یہ اور بہت سی دوسری قسم کی گرہون کے نمونے تفتیش کرنے والے اپنے پاس رکھتے ہین، یہ لوگ گرہون کو ایک دوسرے سے ملاکر مجرم کا پتہ لگاتے ہین، اور اکثر کامیاب ہوتے ہین، چنانچہ ایک معاملہ مین تقریباً تمام شہادتین اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتی تھین کہ مقتول کو کسی جہازران نے کشتی پر سے دریا مین پھینک دیا، لیکن ایک ہوشیار جاسوس نے یہ ثابت کردکھایا کہ جو گرہین اس کے پیرون مین دی گئی تھین وہ ایسے شخص کے ہاتھ کی تھین جو جہازران نہ تھا، اسی طرح ایک دوسرے معاملہ مین مسکرات کے خردہ فروشون کا ایک گروہ گرفتار کیا گیا، جو گرہین ان لوگون نے بنڈلون مین دی تھین وہ ان گرہون سے مشابہ تھین جو اس واقعہ سے قبل اسی قسم کے جرم کی تفتیش مین معلوم ہوچکی تھین، اس فن کا ماہر یہ بھی معلوم کرلیتا ہے کہ گرہ داہنے ہاتھ سے دی گئی ہے، یا بائین ہاتھ سے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض آدمی عادۃً گرہ مین دو ایک پھندا اور دیدیتے ہین، ایسی صورت مین تفتیش کرنے والے ملزم سے اپنے سامنے کسی رسی مین گرہ دینے کو کہتے ہین اور گرہ دیکھ کر اس کے مجرم ہونے یا نہ ہونے کا پتہ لگالیتے ہین،

جرمنی کا ادارۂ صحت

جرمنی کے شہر ڈرسڈن مین ایک مشہور و معروف ادارۂ صحت (HYGIENE MUSEUM) قائم ہے، اول اول اسکا خیال ۱۹۰۳ء مین وہان کے ایک بڑے کارخانہ دار ڈاکٹر لنگنر (Dr. LINGNER) کے ذہن مین آیا، انھون نے ایک ایسے ادارہ کی تعمیر جس سے ہر عامی بھی فائدہ اٹھا سکے ضروری خیال کی، ۱۹۱۱ء مین ڈاکٹر موصوف نے ایک نمایشِ صحت ترتیب دی جو کامیاب ہوئی اور اس معاملہ مین انھون نے اطباء، حکومت اور عوام کا اعتماد حاصل کرلیا، جو سامان ۱۹۱۱ء مین نمایشِ صحت کے لیے فراہم کیا گیا تھا، وہی ادارۂ صحت کی بنیاد قرار پایا، ۱۹۱۶ء مین ڈاکٹر لنگنر کا انتقال ہوگیا، خیال یہ تھا کہ انھین کے ساتھ اس ادارہ کا خیال بھی فنا ہوجائے گا، لیکن خوش قسمتی سے ڈاکٹر موصوف نے اپنے ساتھ کام کرنے والون مین اس کے متعلق اتنا اعتماد پیدا کردیا تھا، کہ ان لوگون نے ہر طرح کی دقتون کے باوجود اس کام کو جاری رکھنے کا عزم کرلیا، غرض اسکا سنگِ بنیاد ۱۹۲۶ء مین رکھا گیا، اور اس کا افتتاح مئی ۱۹۳۰ء مین ہوا، ڈاکٹر لنگنر نے اپنی بیاض مین لکھ چھوڑا تھا کہ یہ ادارہ تمام لوگون کے لیے بطور ایک تعلیم گاہ کے ہوگا، چنانچہ اس منشا کے مطابق یہ نہ صرف اہل جرمنی کے لیے بلکہ دوسرے ممالک کے باشندون کے لئے بھی کھلا ہوا ہے، اس کے بعد موجودہ ڈاکٹر سائرنگ (Dr. SEIRING) ہین جنھون نے سالون ڈاکٹر لنگنر کے ساتھ کام کیا ہے،

"ع ز"

ادبیات

یوم الوصال

از حکیم الشعراء جناب سید احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی،

ہر سانس مین پیغام حبیب آتا ہے — جو دن جاتا ہے، تو قریب آتا ہے،

کب تک سہے کوئی ہجر کا غم آخر — کھنچ کر آنکھون مین آگیا دم آخر

دل بے سبب آج میرا بیکل کیون ہو — شدت سے مرے سینے مین ہل چل کیون ہے

کیا بات ہے کیون ماہی بے آب ہو دل — کس کیلئے آج اتنا بے تاب ہے دل

اس سینۂ بریان مین تپش کیسی ہے — اعضا کی کشاکش مین کشش کیسی ہے،

کیون چبھتی مین آج برچھیان سینے مین — کیون بال پڑے ہین دل کے آئینے مین

جان، جسم مین آج اجنبی سی کیون ہے — سارے اعضا مین آج کپکپی سی کیون ہے

ہے منتظر، اے دل شکستہ! کس کا — اے آنکھ، تو دیکھتی ہے رستہ کس کا

کیون جاتا ہے سانس بالا بالا میرا — کیا آنے کو ہے رفیق اعلےٰ میرا

آخر مرا وقت آگیا، خوب ہوا، — وہ آکے مجھے بلا گیا، خوب ہوا،

اس موت نما حیات سے ڈرتا ہون — زندہ ہونیکے واسطے مرتا ہون،

صد شکر، کہ مجھ سے میرا پیچھا چھوٹا — تھی جس مین خودی کی مے وہ ساغر ٹوٹا

اب طائر پربستہ کے پر کھلتے ہین — مایوسی مین امید کے در کھلتے ہین،

اب تیرگی دیدہ و دل جاتی ہے — وہ موت کی روشنی نظر آتی ہے،

اب آگئی آخری گھڑی راحت کی — صورت نظر آرہی ہے "بے صورت" کی

جادو نظرے، عشوہ گرے می بینم — بے پردہ جمال دلبرے می بینم

اکنون کہ بجلوہ گاہ نازش ہستم — بر ہر سر موئے نیشترے می بینم

ہان پیش نظر جلوۂ قدوس ہے آج — ناقابل احساس بھی محسوس ہے آج

یہ آتا ہے آج کون تقدیس پناہ — ہر جزو بدن کہتا ہے سبحان اللہ

دامن مین گل گلشن ہو، بھرتا ہون — ناقابل لمس کو بھی مس کرتا ہون،

خوشبوئے مسیحا نفسے می آید،

اے روح ز تن برو کسے می آید،

معرکۂ سکون و عمل

یا

فریب سکون،

از مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی لکچرار مدراس یونیورسٹی۔

جہاد زندگی مین کیون تلاش ہو سکون کی — ارے تغافل آشنا یہان عمل کا کام ہے

خراب آرزو نہ ہو، یہ باتین ہین جنون کی — یہ کارگاہ سعی ہے جہان جس کا نام ہے

فروغ خاطر و سکون قلب جس کا نام ہو — یہ سامعہ فریب ہے، نغمہ باصرہ نواز ہے

ہر ایک ان کی جستجو مین آج تیز گام ہے — کسے خبر کہ مرحلہ یہ سخت جان گداز ہے

یہ لفظ ہین نہین مگر وجود ان کا دہر مین — ہزاران کو ڈھونڈئیے نہ آئین گے کہین نظر

نہ بحر مین نہ لہر مین، نہ دشت مین نہ شہر مین
عبث نہ کھو عزیز جان اِن کی دھن مین بے خبرا

امیر ہو، غریب ہو، فقیر ہو کہ شاہ ہو،
ہر ایک اِن کا شیفتہ ہے بزمِ کائنات مین

ذرا بھی عقل و ہوش ہو تو کیون کوئی تباہ ہو
میسّر آئی ہے کسے یہ نعمت اِس حیات مین

ملے گی بعد مرگ ہی اگر یہ چیز مل سکی
پھر اس دو روزہ زندگی مین اسکی جستجو ہی کیون

کہ گوشۂ قبور مین ملی ہے یہ جسے ملی ہے
ہزار حیف کھوئی تو نے اپنی زندگی جو یون

سکون کہتے ہین جسے ہے ایک نام موت کا
یہان سکون کی آرزو بھی ہم نفس گناہ ہے

وہی رہا وہی جیا کہ جس نے کام کچھ کیا
کیا نہ جس نے کچھ یہان وہ خوار ہے تباہ ہے

یہ شور شین یہ ولولے ہی زندگی کی جان ہین
سکوت اور سکون مین کہان مزہ حیات کا

اٹھو اور کر کے کچھ دکھا جو ہمتین جوان ہین
نہین تو چھوڑ معرکہ یہ بزمِ کائنات کا

نہ بدرقے کی فکر کر نہ خوف مشکلات کا
جو سعی و محنت و عمل ترے رفیقِ راہ ہین

ترا ثباتِ عزم خود کفیل ہے نجات کا
یہ نارسائیون کے وہم دل مین خواہ مخواہ ہین

فریبِ راحت و سکون نہ کھا جو کامگار ہے
شراب زہر دار ہے یہ آدمی کے واسطے

نہ دامِ یاس و بے دلی مین آ جو ہوشیار ہے
عذاب خوش گوار ہے یہ زندگی کے واسطے

بہادرون سے چھین لی ہین اس نے دل کی قوتین
جمالِ راحت و سکون عدوے عقل و ہوش ہے

مبارزون کی توڑ دی ہین معرکون مین ہمتین
یہ دل پہ چھا گیا تو پھر نہ ہوش ہے نہ جوش ہے

کیا ضعیف اس نے عزمِ رستمِ نبرد کو
اسی نے کھوئین عظمتین کلاہِ تاجدار کی،

اسی نے دل مین دی جگہ خیال گرم و سرد کو
اسی نے ڈھائین طاقتین سپاہِ بے شمار کی،

یہ رہزنِ حیات ہے یہ دشمنِ نشاط ہے
سنبھل! اٹھ اپنی طاقتِ نہان کو آشکار کر

قوی ہے تیرا عزم دل تو غم کی کیا بساط ہے
بہا کے اپنا خون اس زمین کو لالہ زار کر

باب التقریظ والانتقاد

انتخاب دیوان شمس تبریز

مؤلفہ مولوی عبدالمالک صاحب آروی، شایع کردہ ایوانِ اشاعت گورکھپور، ضخامت ۲۳۵ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت:- عکم

ڈاکٹر نکلسن جنکو ہمارے صوفیانہ ادبیات سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، انھون نے اپنی طالب علمانہ محنت کے ثمرۂ اولین کے طور پر ۱۸۹۸ء مین دیوان شمس تبریز کی چند غزلون کا انتخاب پیش کیا تھا، اور اس پر طالب علمانہ حیثیت سے کچھ خیالات مقدمہ کے طور پر لکھے تھے، ایک نوجوان مستعد صاحب قلم مولوی عبدالمالک صاحب آروی نے بھی اپنے طالب علمانہ ثمرۂ اولین کے طور پر اسی کو پسند کیا ہے، اور اس مقدمہ کو اپنے الفاظ مین ترجمہ کر کے اپنے خیال مین تنقید فرمائی ہے، اور اس کا نام انتخاب دیوان شمس تبریز رکھا ہے،

اس کتاب کا نام انتخاب دیوان شمس تبریز رکھنا بالکل ہی غیر موزون ہے، یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۳۵ صفحون پر مشتمل ہے، جنہین سے دیوان کا انتخاب صرف ۲۵ صفحون مین ہے، ایسی حالت مین اس کتاب کا صحیح نام "نقد بر دیوان شمس تبریز" رکھنا صحیح ہوگا، نہ کہ انتخاب دیوان شمس تبریز، پھر ضروری تھا کہ ان غزلون کے اصول انتخاب پر بحث ہوتی، جن لوگون نے اصل دیوان شمس تبریز پڑھا ہے، اُن کو معلوم ہے کہ یہ دیوان کم از کم (نولکشور ہندوستان مین) ۴۳۵ طویل صفحون اور خفی سطرون مین چھپا ہے، اور اس مین ہزارون غزلین ہین، پھر

وہ کون سا معیار ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر نکلسن نے یا ہمارے مترجم و مبصر نے ۳۵ ہزار میں سے ۲۵ صفحون کو، اور ہزار دون غزلون مین سے صرف ستائیس غزلون کو انتخاب کے لائق سمجھا ہے،

ڈاکٹر نکلسن کی یہ کتاب صرف اسی قدر اہمیت رکھتی ہے کہ یہ انکی آیندہ علمی کوششون کا دیباچہ ہے، ورنہ تحقیق و تفتیش کے لحاظ سے کسی خاص قدر دانی کی مستحق نہین، ہمارا خیال ہے کہ ہمارا نوجوان صاحب قلم اگر ڈاکٹر نکلسن کے افکار سے بے نیاز ہو کر خود محنت کرتا تو شاید مغربی صاحب قلم سے یہ مشرقی صاحب قلم زیادہ کامیاب ہو سکتا،

کتاب مین تصنیف تحقیق، زبان اور طریقہ ادا کی خامیان بکثرت ہین، مثلاً صد۲۱ مین وانٹا کو اٹلی مین بتایا گیا ہے، حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ یہ آسٹریا کے پایۂ تخت کا نام ہے، مولانائے روم کے والد اثنائے سفر مین آرمینیہ کے ایک شہر ارزنجان نامی مین کئی برس ٹھہرے تھے، ڈاکٹر نکلسن نے اس شہر کا نام ارزنجان، اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگار نے ارزنگان لکھا ہے، جو ظاہر ہے کہ پہلے لفظ کی فارسی شکل ہے، مگر مؤلف نے ان دونون کو غلط اس لیے بتایا ہے کہ آرمینیہ مین اس نام کا کوئی شہر نہین ہے، اس لیے اس کے نزدیک صحیح آذربائیجان ہے، کیونکہ پرشین آرٹ کے اندر جو انگریز مستشرقین کی جدید الشیوع تصنیف ہے ..... صوبۂ آرمینیہ کے حدود مین آذربائیجان لکھکر دکھایا گیا ہے؛ حالانکہ آج عام اخبار خوانون کو بھی معلوم ہوگا کہ آرمینیہ اور آذربائیجان دو مستقل ملک پہلے بھی تھے اور آج بھی ہین، اور ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہین،

اور یہ کہنا کہ آرمینیہ مین ارزنجان کوئی شہر نہین، قلت تلاش کا نتیجہ ہے، خود مولانائے روم کے معاصر یاقوت کی مشہور کتاب معجم البلدان مین ہے، "ارزنجان جس کو وہان کے باشندے ارزنکان کہتے ہین، آرمینیہ کا ایک عمدہ مشہور سرسبز و شاداب شہر ہے، بلاد روم اور خلاط کے درمیان رومی ارزن کے قریب واقع ہے" (جلد اول صد۱۹۰، مصر)

عہد رومی کے سیاسیات کا جو باب مؤلف نے اضافہ کیا ہے، وہ تمامتر غیر صحیح لکھا ہے (صد۵۲)

"رومی کا وہ زمانہ تھا جبکہ غزنویہ کا بڑھا ہوا زور کم ہو رہا تھا، عباسیہ کا جاہ و جلال زوال پذیر تھا، اور دنیائے اسلام مین ایک تیسری قوم ترقی کر رہی تھی، جسے آل سلجوق کہتے ہین"

اس کے بعد ہسٹری آف سارا سنس امیر علی اور پرشین آرٹ ایک جدید فنی کتاب سے دو بے جوڑ اقتباسات نقل کئے ہین،

مولانا رومی کی ولادت ۶۰۴ھ مین اور وفات ۶۷۲ھ مین ہوئی، یہ وہ وقت ہے جب کہ غزنویہ کا بڑھنا ہوا نہین، بلکہ ٹھہرا ہوا زور بھی ساحل فنا کو پہنچ چکا تھا، اور مولانا کی پیدائش سے سات برس پیشتر غزنویہ کا چراغ گل ہو چکا تھا، اور غوری خاندان کی نئی حکومت قائم ہو چکی تھی، اور اس وقت عباسیہ کا جاہ و جلال زوال پذیر ہی نہ تھا، بلکہ بغداد مین بھی وہ موجود نہ تھا، وہ مولانا کی زندگی ہی مین ۶۵۶ھ مین تاتاریون کے ہاتھوں تاراج ہو چکا تھا، اور تیسری قوم جس کو آل سلجوق کہتے تھے، ترقی نہین کر رہی تھی، بلکہ اسکی جڑ اصل حکومت سلجوقی واقعۂ شیانبور (اصفہان) کٹ چکی تھی، اور طوائف الملوکی نے اُس کا خاتمہ کر دیا تھا، ایک طرف خوارزمشاہ کی حکومت تھی اور دوسری طرف متفرق اتابکان موصل و دیار بکر و فارس وغیرہ کی، اور روم یعنی ایشیائے کوچک مین سلجوقیون کی ایک شاخ جس کو سلاجقۂ روم کہتے ہین، اپنی انتہا کو پہنچکر زوال پذیر ہو رہی تھی، اور مولانا کی زندگی ہی مین تاتاریون سے شکست کھا کر وہ اکی باجگذار بن چکی تھی،

زبان کا اندازہ ان فقرون سے ہوگا،

رومی کی غزلیات کے اندر کس قدر بے پایان کیفیات، کیسا والہانہ فغان درد، کیسی مضطر حیات، کیسے جمیل نوامیس شعری پائے جاتے ہین" صد۲۸

شاعر عہد صبوت ہی سے ایک عجیب و غریب ہستی رکھتا تھا صد۳۲، ابتدائے چھٹی صدی صد۱۳۷، اکیائی مسلمہ صوفی شاعر تھے، صد۱۳۵، ۱۲۵۴ھ مین وفات کی صد۱۸۱،

طرز گفتار ہر جگہ انانیت اور صیغۂ واحد متکلم کے اظہار و ترفع مین ہے، جو کسی صاحب علم کے آغاز تصنیف کے شایان شان نہین،

حضرت سلطان نظام الاولیاء کے مناظرہ کی جو روداد (جسکا یہان کوئی تعلق نہین) تاریخ فرشتہ

سے نقل کیگئی ہے، وہ قطعاً غلط ہے، حالانکہ اسکی تصحیحات معارف مین دو سال ہوے کہ شایع ہو چکی ہین،

"نفسِ سماع کی حقیقت" کے عنوان سے ایک بے محل باب مین مذکور ہے کہ "سماع کے باب مین امام

غزالی کی بحث نیم مولویانہ و نیم فلسفیانہ رنگ رکھتی ہو کاش امام غزالی کی نیم مولویانہ بحث پر اعتراض کے بجاے اسکو سمجھنے کی کوشش کی جاتی،

صفحات ۱۰۴ و ۱۰۵ اور نیز صفحات ۱۹۴ و ۱۹۵ مین ایک کے اوّل کو دوسرے کے شروع سے کوئی

تعلق نہین،

حضرت غوث اعظم" اور خواجہ معین الدین چشتی کے دوادین اور انکی غزلون کا اس طرح ذکر کیا گیا

ہے، کہ گویا یہ واقعی اُن کے دواوین ہین، حالانکہ اس کے ثبوت کے لیے دلائل کی ضرورت ہے، پھر اُن

تنقید کا یہ طریق،

"لیکن حضرت غوث اعظم کے پورے دیوان مین صوفیانہ اشعار اسی مولویانہ غلو کی آمیزش

کے ساتھ ہین" (۱۳۹)

نازیبا ہے،

حضرت خواجہ معین الدین کی طرف جس دیوان کی نسبت کیگئی ہو، وہ مولانا معین الدین فراہی صاحب معارج النبوۃ

کی تصنیف ہے، نہ کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی،

"پیر کا عقیدہ" کے عنوان سے چند صفحے لکھے ہین، جو تمامتر بے محل ہین، اور جو معلومات ہندوستان اور

شیعی شعراء وغیرہ کے متعلق صرف کیے ہین، وہ موضوع سے سراسر خارج ہین، اور جو نتیجہ پیدا کیا ہو وہ گو نکلسن

اور انسائیکلوپیڈیا نام کسی کوب کن کتاب کے مضمون نگار کی تائید مین ہے، تاہم وہ صد درجہ گمراہ کن ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوان مؤلف کو چند مختلف کتابین ہاتھ آگئی ہین، وہ اُنکے معلومات

کو یکجا کرکے، ایک کتاب بنانے پر تلے ہوئے ہین وہ کتابین یہ ہین، انگریزی مین ڈاکٹر نکلسن کا مقدمۂ انتخاب

دیوان، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس، ہسٹری آف سارا سنس اور پرشین آرٹ،

فارسی مین نفحات الانس، تاریخ فرشتہ اور کیمیاے سعادت،

مؤلف کی اس تحقیق کی نسبت معلوم نہین اہل نظر کیا کہینگے،۔

(ابتدائے دکذا) چھٹی صدی سے قبل فارسی زبان مین صوفیانہ شاعری کا پتہ نہین" ص ۱۳۰

کم از کم کیا سلطان ابو سعید ابو الخیر المتوفی ۴۴۰ھ اس سے پہلے نہین گذر چکے؟ ہان یہ کہتے کہ صوفیانہ مسائل

کی تعبیر سنائی المتوفی ۵۴۵ھ سے پہلے فارسی شاعری مین داخل نہین ہوئی تو یہ ایک حد تک صحیح ہے،

تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی کے متعلق مؤلف یا نکلسن کی راے ہے، کہ "اس کا مصنف مستند اور پابند ضابطہ

تسلیم کیا جاتا ہے" بہرحال اُن کی ابتدائے طلب علم کا تجربہ ہوگا، ورنہ باتفاق ناقدین فن یہ تذکرہ خرافات اور تاریخی

اغلاط سے لبریز، اور اسی لیے غیر مستند ہے، چنانچہ خود اسی دولت شاہ کے گب اڈیشن کے انگریزی دیباچہ مین پروفیسر

براؤن نے لکھا ہے کہ یہ مصنف نہ تو قدیم العہد ہے اور نہ بالکل مستند ہے" (ص) مولانا شبلی شعر العجم جلد اول مین اسکے

متعلق رقم فرما ہین، "مشہور تذکرہ ہے، اور گو اکثر جگہ غلطیان کی ہین، تاہم دلچسپ اور مفید ہے" (ص)

اس نقل کفر کے لیے مؤلف کے پاس جسکو ہم مسلمان جانتے ہین کیا عذر ہے،

"جس نے اسلام کی بنجر زمین مین ابتدا ء جڑ پکڑ رکھا تھا" ص ۳۳

کیا اسلام پر زمین شور کا طعنہ بلا تردید یا تصحیح خیال، ایک مسلمان صاحب قلم کو ادا کرنا چاہیے؟

فیہ ما فیہ مولانا ے روم کی نثر مین ایک تصنیف ہے، ڈاکٹر نکلسن کو اپنی اس طالب علمانہ کتاب لکھتے وقت

تک اس کتاب کا، یا اُس کے وجود کا علم نہ تھا، اس لیے اُن کی کتاب مین اس کا نا آشنا یا نہ تذکرہ برا نہ تھا، مگر اس

اردو انتخاب دیوان سے چند سال پہلے مولٰنا کی یہ کتاب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی تصحیح سے معارف

پریس سے چھپکر عام ہو چکی ہے، اس لیے ہمارے مؤلف کی اس نا آشنائی تعجب انگیز ہے،

اس کتاب مین اصل بحث جس کے دیکھنے کے ہم تمنی تھے یہ تھی کہ یہ دیوان جو شمس تبریز کے نام سے موسوم ہے

در اصل کس کا ہے، اور اس بات پر کہ یہ اصل مین مولانا ے روم کی تصنیف ہے، کیا قدیم شہادتین موجود ہین،

مگراس مسئلہ کیطرف اس کتاب مین کوئی اشارہ تک نہین کیا گیا ہے،

گر بہرحال اس کتاب کے اوراق مین مؤلف کی ذہانت، تیز طبعی اور سعی پرواز کی علامتین بہت کچھ نمایان نظر آتی ہین، اس لیے امید ہے کہ اگر وہ غور و فکر، تحقیق و تفتیش، تلاش و جستجو اور وسعت مطالعہ سے کام لینگے تو ہماری زبان کی وہ قابل قدر خدمت بھی آیندہ انجام دیسکتے ہین،

"ن"

سیرۃ النبی صلعم جلد چہارم

(منصب نبوت)

جس مین اولاً

مقدمہ مین منصب نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم و خصائص پر بحث ہے، پھر قبل از اسلام دنیا کے متمدن ممالک اور خصوصاً عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت کی تفصیل ہے،

اور اس کے بعد

نبوت محمدی نے دنیا اور عرب کیلئے جس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا، اسکا اجمالی بیان ہے، اصلاح کی مشکلات، ان کا انسداد، تبلیغ و دعوت، اور اسکی کامیابی، عرب کے عقائد کی اصلاح، شرک کے ہر پہلو کی تردید، توحید کی تکمیل، اسلامی عقائد کی تشریح، خدا اور اس کے صفات کاملہ، ملائکہ، انبیاء، کتب الہی، روز جزاء، اور تقدیر پر ایمان کے مباحث، اور ان کے ضمن مین متعدد اہم مسائل کی تشریح،

اگر آپ کو

اسلام کی اس حقیقت کو سمجھنا ہے، جو وحی محمدی مین بیان کیگئی ہے، تو سیرۃ کی اس جلد کا مطالعہ فرمائین،

ضخامت ۹۰۰ صفحے، تقطیع کلان، قیمت قسم اعلیٰ آٹھ روپے، قسم دوم چھ روپے، محصول ڈاک ایک روپیہ بارہ آنہ پیکنگ وغیرہ معاف،

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

رموز حکمت: مؤلفہ مولانا محمد شریف صاحب صدر مدرس مصباح العلوم الہ آباد، انوار المطابع لکھنؤ، ص ۲۲۵ قیمت ؏،

یہ اردو مین فلسفۂ قدیم کی ایک صاف اور سلجھی ہوئی ابتدائی کتاب ہے، شروع مین فلسفہ کی، اور مسلمانون مین اوسکے شیوع کی تاریخ ہے، پھر فلسفہ کی تعریف اور تقسیم ہے، قدیم فلسفہ ابتداءً حکمت عملی اور حکمت نظری پر منقسم ہے، حکمت نظری پھر متعدد اقسام مین منقسم ہے، جن مین سے دو مشہور قسمین طبعیات اور الٰہیات ہین، زیر نظر کتاب فلسفۂ قدیم کی ان تینون شاخون، حکمت عملی، طبعیات اور الٰہیات پر مشتمل ہے، اور حکمت عملی مین ایک بڑا حصہ اخلاق کو دیا گیا ہے، اس طرح یہ فلسفہ، اخلاق، طبعیات اور الٰہیات کے مباحث پر مشتمل ہے،

مصنف کتاب ہمارے قدیم فلسفہ کے ماہر اور ہماری قوم کے پچھلے اساتذۂ علم و حکمت مولانا ہدایت اللہ خان صاحب اور مولینا حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی کے شاگرد رشید ہین، اسلئے فلسفہ کے مسائل کے بیان مین انکا قلم پوری طرح منجھا ہوا ہے، مصنف کا میلان حضرت محی الدین ابن عربی کے فلسفہ کی طرف پورے اخفا کے باوجود نمایان ہے،

یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہمارے عربی خوان مدارس کے طلبہ اس کا مطالعہ کرین اور منشی فاضل کے طلبہ اوسکو درس مین رکھین اور ساتھ ہی قدیم فلسفہ کا شوق رکھنے والے اوسکو پڑھین،

تعجب ہے کہ مصنف نے غلط دان انگریزی خوانون کی طرح شہر فاس کو فیض لکھا ہے، ص ۱۱،

نظام علی خان: مؤلفہ جناب محمد سراج الدین صاحب طالب شمس الاسلام پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن ص ۱۰۴، کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت ؏،

نظام الملک آصفجاہ ثانی نظام علی خان کی سوانح عمری اگرچہ اس سے پہلے آصفجاہ ثانی کے نام سے شایع ہوئی ہے لیکن نظام علی خان کے مؤلف نے اسی موضوع پر مزید تالیف کی اسلئے ضرورت محسوس کی کہ سوانح آصفجاہ ثانی میں اُن کے تخت نشین ہونے کے اسباب پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، اور دراصل اس عنوان بحث کے تشنہ رہ جانے سے سیرت آصفجاہ ثانی کی تکمیل نہیں ہوسکتی، مؤلف نے نظام علی خان میں یہ اور اسی قسم کے مباحث کو پھیلا کر لکھا ہے، اس وقت اسکا پہلا حصہ پیش نظر ہے، اسمیں ولادت سے تخت نشینی تک کے حالات ہیں، اور اس حصہ میں دو مباحث خصوصیت سے زیر بحث رہے ہیں، اولاً سلطنت آصفیہ سے فرانسیسی اور انگریزی کمپنی کے تعلقات جس میں فرانسیسی کمپنی کے تعلقات کا آغاز انگریزوں کی ریشہ دوانیاں، فرانسیسی تعلقات کا انقطاع انگریزوں سے معاہدہ کا انعقاد، اور پھر فرانسیسی تعلقات کا احیا، وغیرہ اور اون کے داخلی اور حقیقی اسباب بیان کئے ہیں، اور دوسرا مبحث نظام علی خان کے پیشرو فرمانروا یا ناظم دکن صلابت جنگ اور نظام علی خان کے تعلقات کو پھیلا کر دکھایا ہے، اور پھر صلابت جنگ کے معزول کرنے کے اسباب بیان کئے ہیں، آخر میں نظام علی خان کے اس عہد تک کے حالات پر اجمالی تبصرہ کیا ہے اور دکھایا ہے کہ اونھیں حصول سلطنت کا خیال کب اور کیونکر پیدا ہوا، اور صلابت جنگ کے معزول کرنے میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے،

مؤلف نے فرانسیسی انگریزی اثر و اقتدار کے عروج و زوال اور صلابت جنگ اور نظام علی خان کے باہمی تعلقات کے بیان میں واقعات سے جو قیاسات قائم کئے ہیں، متضاد بیانوں میں تطبیق دیکر اپنے نظریہ کی جو تائید حاصل کی ہے اون میں اگرچہ کہیں کہیں تشفی نہیں ہوتی، تاہم اکثر مقامات پر لائق مؤلف کامیاب ہوئے ہیں، اگرچہ ایسے مواقع بھی ہیں جہاں محض قیاسات پر حقائق کو منطبق کرنا چاہا ہے، اور تاریخی استناد و استشہاد کو محض قیاسی دلائل سے رد کیا ہے، اور یہ قیاسات درایت کی حیثیت سے بھی برمحل نظر نہیں آتے، لیکن مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں، کہ نظام الملک آصفجاہ ثانی کی سیرت میں حصول سلطنت کے پہنچنے تک کی زندگی پر تحقیق و تدقیق اور اختلافات کے حل کرنیکی ایک مستحسن کوشش کیگئی ہے، لیکن افسوس ہے کہ زبان میں طرز ادا، الفاظ کے صحیح استعمال جملوں کی ترکیبوں اور کہیں کہیں تذکیر و تانیث کی غلطیاں اور خامیاں نظر آتی ہیں، جو ہمیں ایسی صاف ستھری چھپی ہوئی کتابوں میں جو غور

و فکر اور تحقیق سے لکھی گئی ہوں، اور زیادہ بُری معلوم ہوتی ہیں،

سکہ اور شرح مبادلہ

مؤلفہ جناب سید محمد احمد صاحب کاظمی بی اے ایس سی ایل ایل بی علیگ، ناشر نظامی پریس بدایون ص ۴۵ قیمت عہ

سال گذشتہ ماہ ستمبر میں انگلستان کی وزارت کی تبدیلی کے بعد انگلستان اور ہندوستان میں سونے اور مبادلہ کے متعلق جو ہنگامی قوانین نافذ کئے گئے تھے، اون کی تشریح کے لئے اردو کے اخبارات میں سکہ اور شرح مبادلہ پر مضامین نکلے تھے، اسی سلسلہ میں جناب سید محمد احمد صاحب کاظمی نے اخبار ذوالقرنین بدایون میں ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا، لیکن اوسکی تکمیل نہ ہوسکی، اس لئے نظامی پریس کی طرف سے اوسکو رسالہ کی شکل میں شایع کیا گیا ہے، اس رسالہ میں سکہ اور شرح مبادلہ کو اصولاً بیان کرنے کے بعد ہندوستان میں حکومت انگلشیہ کے قیام کے بعد سے سکہ پر جو مختلف دور گذرے ہیں، اونھیں بیان کیا ہے، اسلئے انگریزوں کے عہد کے ہندوستانی سکہ کی مفصل تاریخ منضبط ہوگئی ہے اور اسی ذیل میں ایسٹ انڈیا کمپنی، انگلستان اور حکومت ہند کے درمیان سکہ اور شرح مبادلہ پر اب تک جو مراسلتیں ہوئیں، جو مباحث ہوئے، جو قوانین نافذ کئے گئے، جو کمیشن مقرر ہوئے، اور مختلف عہدوں میں سکہ کی قیمتوں میں جو اوتار چڑھاؤ رہا، اور اوسکے جو اسباب و علل رہے، اور سوراج پارٹی کے عہد میں اسمبلی میں جو مباحث ہوئے سب کو اجمالاً پیش کیا ہے، اور حکومت ہند اور ہندوستانی محب وطنوں کے زاویۂ نگاہ میں سکوں کے متعلق جو اختلافات رہے ہیں اونھیں تفصیل سے بیان کیا ہے، اور آخر میں دکھایا ہے، کہ جب تک ہندوستان میں سونے کے سکے رائج نہ کئے جائیں، یا چاندی کے سکوں کی قیمتیں فرضی قرار دئے جانے کے بجائے واقعی نہ قرار پا جائیں یعنی مثلاً ایک روپیہ میں واقعی ایک روپیہ کی چاندی داخل نہ کی جائے، اوس وقت تک ہندوستانی سکہ کا صحیح حل نہ ہوسکے گا، اور بازار میں اوسکی واقعی قیمت قائم نہ ہوسکے گی، اور اوس کی وجہ سے ہندوستان کو ہمیشہ نقصانات اوٹھانا پڑیں گے، ملک کے تجارت پیشہ اصحاب اور لین دین کرنے والے اشخاص اور نیز سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ایک کارآمد رسالہ ہے، اس سے پیچیدہ اقتصادی مسائل پر روشنی پڑتی ہے لیکن جنھیں اقتصادیات سے دلچسپی نہیں اونھیں

رسالہ کسی قدر دقت نظر سے پڑھنا پڑیگا،

مے دو آتشہ یعنی ترجمۂ رباعیات عمر خیام از جناب شوکت بلگرامی مرتبہ جناب سید محمد علی صاحب ناشر مکتبۂ

ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن، تقطیع چھوٹی قیمت عہ

عمر خیام کی رباعیون کے کئی منظوم اور غیر منظوم ترجمے اردو مین شایع ہو چکے ہین لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ شاید اوسکے منظوم ترجمہ کی ابتدا سب سے پہلے جناب شوکت بلگرامی مرحوم (حیدرآباد دکن) نے کی تھی لیکن وہ چند رباعیون کا ترجمہ کرکے رہ گئے، اب انھی منظوم مترجم رباعیونکا مجموعہ دو آتشہ کے نام سے اون کے خلف جناب سید محمد علی صاحب بلگرامی نے مرتب کرکے شایع کیا ہے، مجموعہ کی ابتدا مین مرتب کی جانب سے مترجم کے مختصر حالات ہین، اور پھر اس منظوم ترجمہ اور اوس کے ماسبق ترجمہ مین موازنہ کیا ہے، اور ایک ہی رباعی کے دونون ترجمے یکجا دکھائے ہین اوس کے ترجمہ پر چند اکابر نواب حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی، یمین السلطنۃ سر کشن پرشاد بہادر، نواب عماد الملک بلگرامی، نواب صدر یار جنگ بہادر، اور شمس العلما، نواب سید امداد امام صاحب اثر کی تقریظین مندرج ہین جن مین سے بعض مین خیام کے حالات اور بعض مین اوسکے فلسفہ اور بعض مین اس اردو منظوم ترجمہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے، اور آخر مین رباعیان اور اون کے ترجمے اس ترتیب سے درج ہین، کہ ایک صفحہ پر فارسی رباعی اور اوس کا انگریزی ترجمہ اور اوسکے مقابل کے صفحہ پر شوکت کا اردو ترجمہ ہے، مترجم نے اس ترجمہ مین لفظی پابندیون کے بجائے معنوی پابندی رکھی ہے، اور فارسی رباعی کا مفہوم اردو کی رباعی مین ادا کیا ہے، اس مین شبہ نہین کہ اب تک جو منظوم ترجمے چھپے ہین، مجموعی حیثیت سے یہ ترجمہ اون پر سبقت لے گیا ہے، اگرچہ فی الجملہ یہ بھی صحیح ہے کہ دوسرے ترجمون مین لفظی پابندی کے حدود قائم رکھنے کا خیال رکھا گیا ہے جس سے یہ جدید منظوم ترجمہ خالی ہے،